اقبال اور عظمت آدم

بہ تعاون پاکستان ھائی کمیشن نئی دھلی

قید امتیاز

اقبال اور عظمتِ آدم

(ایک تقابلی مطالعہ)

قدیر امتیاز

ناشر
شالیمار پبلیکیشنز نیا ملک پیٹ، حیدرآباد

پیش لفظ

اس اقبال صدی میں فکرِ اقبال کے جہاں نئے گوشے سامنے آرہے ہیں، وہیں اقبال کی شاعری کی نئی جہتوں کا تعین بھی ہو رہا ہے۔ دراصل اقبال معانی کا ایک ایسا سمندر ہے جس کے کنارے دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ اقبال کے فکر و معانی پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ان میں بیشتر کتابوں میں افکارِ اقبال کا مغربی فلسفہ کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ کلامِ اقبال کو مغربی مفکرین کی روشنی میں دیکھنے کی روش اتنی عام ہو چلی ہے کہ اُردو شعراء اور ادباء سے افکارِ اقبال کے تقابلی مطالعہ کی اہمیت کو یا تو نقادوں اور مصنّفوں نے پوری طرح محسوس نہیں کیا، یا پھر یہ سمجھ کر چُپ سادھ لی کہ چند ایک مضامین ہی اس پر کافی ہیں۔

--

میں یہ نہیں کہتا کہ اقبال کے افکار کا مغربی اور دوسرے فلسفوں کی روشنی میں جائزہ لینا اہم نہیں ہے ۔ اس کی تو بہرحال اہمیت ہے اور بڑی اہمیت ہے ۔ اور اس سے مفر کی صورت بھی نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ دوسری جہتوں کی جانب توجہ دینا بھی کچھ کم ضروری نہیں ہے ۔ چنانچہ میں نے اس پہلو پہ روشنی ڈالنی ضروری سمجھی اور ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے جو ایک تو قدرِ مشترک ہو اور دوسرے زیادہ گھسا پٹا نہ ہو ۔

عظمتِ آدم کا تصوّر یوں کوئی نیا تصوّر نہیں ہے لیکن اس پر یا تو بہت کم لکھا گیا ہے، یا پھر چند ایک حضرات سے ہٹ کر دوسروں کی نظر اس پر نہیں پڑی ہے ۔ "اقبال اور عظمتِ آدم" کا موضوع دراصل آل انڈیا ریڈیو بنگلور کا دیا ہوا ہے جس پر میں نے اقبال صدی پروگرام کے سلسلے میں ایک ریڈیائی تقریر لکھی تھی اور یہ موضوع کچھ اتنا پسند آیا تھا کہ میں نے سوچا تھا کہ مستقل طور پر اس پہ ایک کتاب لکھی جائے اور اس طرح اقبال پر یہ مختصر سی کتاب سامنے آئی ہے ۔ گو میری تحریر کا محور اقبال رہا ہے لیکن اقبال سے دوسرے شعرا کا تقابل کرتے ہوئے میں نے اُردو ادب میں تصورِ عظمتِ آدم کو اُجاگر کیا ہے ۔

میرؔ سے پنڈت آنند نارائن ملّاؔ تک کے عہد کا میں نے جائزہ لیا ہے ۔ اور اس غلط فہمی کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو شاعری میں حزن و ملال یاس اور قنوطیت کے سوا کچھ دھرا نہیں ہے ۔ اُردو شعرا کو شروع ہی سے عظمتِ آدم کا احساس رہا ہے اور اُردو شاعری کبھی محدود نہیں رہی ہے ۔ اس نے فکر و فلسفہ کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے ۔ اُردو شاعری مایوس ذہنوں کا مرثیہ نہیں بلکہ رجائیت کی علمبردار ہے ۔

مختلف اقوام میں عظمتِ آدم کا تصوّر جُداگانہ رہا ہے۔ یونانیوں کے ہاں انسانی عظمت اخوتِ انسانی میں مضمر ہے تو جیوش کے یہاں انسان کی عظمت کی نشانی خدا کی خوشنودی حاصل کرنے میں ہے۔ وہ تو انسان کو خدا کا پرتو سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی تصوّر عظمتِ آدم "آتما" کے استحکام اور اس کی بلندی و رسائی پر مبنی ہے جبکہ چینی آتما کا تصوّر نہیں رکھتے۔ وہ تو یہ بھی نہیں مانتے کہ انسان میں آتما کی شکل میں کوئی شئے چھُپی ہوئی ہے۔ چینی تو انسان کی عظمت کو اس کی فطری صلاحیتوں کی بنیاد پر مانتے ہیں ان کا خیال ہے کہ انسان فطری طور پہ بذاتِ خود بہتر ہوتا ہے جبکہ ابن عربی اور عبدالکریم جیلی نے انسان کو خدا اور قدرت کا مظہر بتلاتے ہوئے اس کو ایک واسطہ قرار دیا ہے۔ جیلی کے یہاں انسان، ذاتِ باری کی شان سرمدیت میں شامل نہیں ہو سکتا جبکہ رومی اور اقبال کے یہاں خدا تک رسائی اور خدا کی خودی کو مسخّر کر کے اپنانے کو انسان کی معراج بتلایا گیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ\
غالب و کار آفریں کار کُشا کارساز\
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات\
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

ہندوستانی مفکّرین کے یہاں بھی عظمتِ آدم کے الگ الگ معیار ملتے ہیں۔ ٹیگور کو انسانی صلاحیتوں کا احساس ہے۔ وہ انسان کی عظمت کو اس کی تخلیقی صلاحیتوں میں پاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مادیت نے انسان

کو روحانی اور انسانی اقدار سے دُور رکھا ہے۔ روحانیت اور انسانیت ہی کے ذریعہ انسان اپنی شناخت کر سکتا ہے۔ وہ بنی نوع آدم سے محبت کو انسانی عظمت کی ضمانت سمجھتے ہیں کیونکہ اس طرح سارے انسان ایک عالمگیر انسانی رشتہ میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ رادھا کرشنن نے بھی خدا سے انسان کے قلبی ربط پر زور دیا ہے تاکہ انسان خود میں الوہی صفات پیدا کرے اور وہ روحانی بلندی پیدا کرے جس سے اس کے قلب و نظر میں وسعت آئے اور دنیا کے اسرار و رموز اس کے لئے معمہ نہ رہیں۔ رادھا کرشنن کے یہاں عظمتِ آدم کا تصوّر روحانیت اور انسانیت پر مبنی ہے۔ وہ انسان دوستی، بھائی چارگی اور اخوت کو مقام آدم کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں انہی اوصاف سے انسان پہچانا جاتا ہے سری اروبندو گھوش نے یوگا کے ذریعہ روحانی قوت کے استحکام اور الوہی صفات اور الوہی رہنمائی سے بہرہ ور ہونے کی تعلیم دی ہے۔ ان کا ما فوق ذہن کا تصوّر بھی اسی مقصد کا احاطہ کرتا ہے کہ انسانی شعور روحانی شعور کی بلندیوں کو چھوئے اور اس طرح نئے آدم کا ظہور ہو اور نئی دنیا وجود میں آئے۔

نتشے نے عظمتِ انسانی کی بہترین مثال تصوّر فوق البشر میں پیش کی ہے۔ نتشے کے تصوّر فوق البشر میں اخلاقی اقدار کی بہ نسبت قوتِ عمل پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ قوت ہی کے ذریعہ انسان ہر ایک پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بقول یوسف حسین خاں نتشے کا فوق البشر اخلاقی خوبیوں کو کمزوری پر محمول کرتا اور خیر و شر کو محض اضافی حیثیت دیتا ہے۔

اس کے نزدیک قوی شخص ہی نیکوکرداری کا اعلیٰ نمونہ پیش کر سکتا ہے۔ عدل و مساوات، بقائے اصلح کے خلاف ہیں۔ وہ دراصل بقائے اقوی کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک عزم قوتِ زندگی کا واحد مقصد اور اس کی حقیقی قدر ہے۔ عدل کی جگہ قوت و اقتدار کو جو آفاقی جوہر ہے انسانی مقدر کے فیصلہ کرنے کا پورا اختیار ہونا چاہئے۔" نطشے کے خیال میں خدا کے تصور سے انسان کی عظمت پر حرف آتا ہے اور اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے جبکہ اقبال کے یہاں خدا کے تصور سے انسان کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ وہ سوائے خدا کے کسی اور کے آگے جھکنا نہیں چاہتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، عزیز احمد اور اشفاق حسین نے مغربی افکار سے اقبال کے افکار کا تفصیلی اور بھرپور تقابل کیا ہے۔ رُوحِ اقبال اور فکرِ اقبال سے بہتوں کو تحریک ملی ہے اور ان دو کتابوں کی وجہ سے اقبال پر کئی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ان سے بہتوں نے اپنے چراغ جلائے ہیں اور اقبال فہمی اور اقبال شناسی کے لئے فضا بنی ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ میں نے اس کتاب کے سلسلہ میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، خلیفہ عبدالحکیم، عزیز احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ، غلام رسول مہر، پروفیسر سلیم چشتی، ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، اشفاق حسین اور دوسروں کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں میں اپنے اساتذہ ڈاکٹر حفیظ قتیل اور جناب اکبرالدین صدیقی صاحب کا بے حد ممنون ہوں۔ جنھوں نے مسودہ کو پڑھا اور اپنی آراء سے نوازا اور جن کی ہمت افزائی نے مجھے ایک نیا حوصلہ دیا ہے،

اس سلسلہ میں اگر میں جناب وقار خلیل جناب خالد عرفان اور جناب محمود خاور کے نام نہ لوں تو ناسپاسی ہوگی۔ ان اصحاب نے ہر قدم پر مجھ سے تعاون کیا اور ہر حیثیت سے میرے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے۔

یہ کتاب استاد محترم ڈاکٹر مسعود حسین خاں وائس چانسلر جامعہ ملیہ کے نام معنون کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے کہ اقبال کو جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آپ جیسے اقبال فہم اور اقبال شناس ہی کا فیض ہے کہ مجھ میں اقبال فہمی کے جراثیم سرایت کرتے جا رہے ہیں۔

میں مالک شالیمار پبلیکیشنز کا شکر گزار ہوں کہ جن کی توجہ اور اہتمام سے یہ کتاب منظر عام پر آسکی ہے۔

قدیر امتیاز
شعبۂ اردو
سینٹ جوزف کالج بنگلور ۱

انتساب

اُستادِ محترم

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

(وائس چانسلر جامعہ ملّیہ اسلامیہ)

کے نام

حرفِ آغاز

عصرِ حاضر میں کلامِ اقبال کی گہرائی، ہمہ گیری، جامعیت، اور شش جہتی کا کون ہے جو معترف نہیں۔ علّامہ اقبال نے فلسفہ و حکمت کے قدیم و جدید مکاتیبِ فکر، اخلاقی اصول، دنیا کی مختلف تہذیبوں کے نظام ہائے حیات، تمدنی و معاشرتی قواعد و ضوابط، انفرادی و اجتماعی زندگی کے طور طریق، سماجی، سیاسی اور تہذیبی ارتقا پذیر رجحانات، زبانوں اور مذاہب کے مسائل، تصورات کے تنوع اور افکار کی ثروت، اسلامی و غیر اسلامی تصوف وغیرہ کے علاوہ بے شمار فکر انگیز موضوعات کا احاطہ کیا ہے لیکن ان کا پسندیدہ موضوع بشریت، تصوف اور تصورِ عظمتِ آدم ہے۔ وہ صرف اس تصوف کے قائل ہیں جو قرآن مجید اور آنحضرت صلعم کے ارشادات و تعلیمات سے

ماخوذ ہے۔ اسی لئے وہ تصوف کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ مثنوی "اسرارِ خودی" بھی اسی مقصد کے تحت لکھی گئی تھی جس میں اقبال نے اپنے فلسفہ کے مرکزی خیال یعنی "تخلیقی انا" یا "نظریۂ خودی" کو پیش کیا جو میری نظر میں عظمتِ آدم کا دوسرا نام ہے اور جو حیاتِ انسانی کے لئے لازم ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ تو وہ خدا تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی خود شناس بن سکتا ہے۔ اقبال کا ایک مقصد ارتقاء پذیر مثالی انسانی معاشرہ کا قیام بھی تھا جو مادی و روحانی ترقی کے ذریعہ صلاحِ دنیوی اور فلاحِ اُخروی حاصل کر سکے اور اسی روشنی میں وہ صرف ایک طبقہ کے نہیں بلکہ ایک ایسی وسیع و عریض عالمِ انسانیت کے شاعر بن جاتے ہیں جو موجودہ برق رفتار زمانے اور مشینوں کے دھویں سے سیہ پوش فضا میں اپنی انفرادیت کا اثبات تلاش کر رہی ہے۔ اقبال کی عمیق فکر اور شاعری کے تہہ دار گوشے انسانی اقدار، موجودہ تہذیبوں اور آنے والی نسلوں کو تازگی، روشنی، حرارت اور حرکت بخشنے کے ساتھ ساتھ آدم کو صحت مند فکر اور ایک متحرک کائنات کے مثبت نظریئے سے روشناس کراتے ہیں۔ اقبال نے ایک نئے آدم ـــــ ایک مردِ کامل کی تخلیق کا نہ صرف ساز چھیڑا بلکہ اُسے ملائیت اور مودودیت کے چکر سے نکال کر "خود آگہی" کی تابناک

راہ بھی دکھلائی ہے۔

اقبال کے فلسفیانہ و حکیمانہ اصطلاحات، فارسی و عربی تراکیب، تہہ دار باتیں، فکر انگیز مضمون آفرینی، شکوہِ لفظی و معنویت آیاتِ قرآنی اور احادیث کا استعمال، تاریخ اور سلف کے تذکرے مشاہیر، حکماء اور علماء کے اقوال اس امر کے متقاضی تھے کہ ان کی توضیح و تشریح کے لئے شرحیں لکھی جائیں۔ چنانچہ شرحیں لکھی اور چھاپی گئیں لیکن سوائے چند اربابِ فکر و نظر کے سبھی اس باب میں ناکام رہے یا پھر کلامِ اقبال کے ساتھ حقیقی انصاف نہ کر سکے۔

گزشتہ چار دہوں میں ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خاں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، خلیفہ عبدالحکیم، خواجہ غلام السیدین، میاں محمد شریف، مولانا اسلم، عبدالرحمٰن بجنوری، کلیم الدین احمد، فیاض محمود، محمد عزیز احمد، عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر عبدالحق، جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر غلام عمر خاں وغیرہم نے اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب سعی کی ہے ـــــ جناب قدیر امتیاز کی زیر نظر تصنیف "اقبال اور عظمتِ آدم" جو شالیمار پبلیکیشنز کے سلسلۂ مطبوعات کی تینتیسویں کڑی ہے علامہ اقبال کے ایک خوبصورت توانا اور نوعِ انسان کے لئے لازمی گوشے یعنی عظمتِ آدم پر نئے

اور بھرپور انداز سے روشنی ڈالتی ہے۔ موصوف ادبی دنیا کے لئے جانے پہچانے ہیں۔ قبل ازیں ان کا ایک ناول "رعنا" چھپ چکا ہے لیکن گزشتہ چند برسوں سے یہ سنجیدہ ادب کی طرف زیادہ توجہ دے رہے ہیں اور سہل الحصولی سے عسیر الحصولی کی جانب موصوف کا یہ سفر انھیں صحیح مقام دلائے گا۔ قدیر امتیاز نے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ اس بات کا طلبگار تھا کہ اس کے ساتھ ممکنہ انصاف کیا جائے اور میرا خیال ہے کہ یہ کامیاب رہے ہیں۔ شعراء خصوصاً علاّمہ اقبال اور مفکرین کے ہاں عظمتِ آدم کا کیا تصور تھا، اس پر موصوف نے جس سلیس انداز میں روشنی ڈالی ہے اس کے باعث توقع ہے کہ اقبال شناسی کے باب میں یہ کتاب ایک خوشگوار اضافہ سمجھی جائے گی۔ چونکہ کتاب میں شامل دیگر مضامین بھی لمحاتِ فکر عطا کرتے ہیں اس لئے میں بحیثیتِ ناشر قدیر امتیاز کو مبارک باد دیتا ہوں۔ شالیمار پبلیکیشنز نے اب تک معیاری ادب پیش کیا ہے، اور اُمید ہے کہ "اقبال اور عظمتِ آدم" بھی قبولیت حاصل کرے گی۔

محمود خاور

ایم۔اے

فہرست

صفحہ

پیش لفظ

حرفِ آغاز

میر اور عظمتِ آدم ۱۷

غالب اور عظمتِ آدم ۲۶

یاس یگانہ اور عظمتِ آدم ۳۴

ابو الکلام آزاد اور عظمتِ آدم ۴۴

اقبال اور عظمتِ آدم ۴۹

اقبال اور جوہر شناسی ۶۳

انسانیت کی عظمت اور اقبال .. ۷۷

جوش اور عظمتِ آدم ۸۲

احمد ندیم قاسمی اور عظمتِ آدم .. ۸۶

پنڈت آنند نارائن مُلّا اور عظمتِ آدم ۹۴

اقبال کی غزلیں .. ۱۰۲

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

اشاعت : جنوری ۱۹۷۶ء
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد ۲
کتابت : محمد ولی الدین
سرِ ورق : صبا
قیمت : آٹھ روپے
سلسلۂ مطبوعات نمبر ۲۳
ناشِر
شالیمار پبلیکیشنز ۔ نیا ملک پیٹ ۔ حیدرآباد ۳۶

ملنے کے پتے

شالیمار پبلیکیشنز ۔ نیا ملک پیٹ، حیدرآباد ۳۶
برگ آوارہ (ہفتہ وار) ترپ بازار، حیدرآباد ۱
مصنّف : صدر شعبۂ اُردو ۔ سینٹ جوزف کالج، بنگلور ۱
انجمن ترقی اُردو ۔ اُردو گھر، راؤز ایونیو، دہلی ۔ ۱
مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی، علی گڑھ، دہلی ۔
اَدبی ٹرسٹ بک ڈپو ۔ کنارا بنک، عابد روڈ حیدرآباد ۱
اُردو لائبریری سنٹر ۔ سٹی مارکٹ، بنگلور ۲

میر اور عظمتِ آدم

میر کا تصورِ انسان یوں تو اثباتی ہے لیکن اس میں تصوف کے وہ عناصر بھی شامل ہیں جو انسانی عظمت اور انسانی خودی کی نفی کرتے ہیں۔ ایک طرف انا الحق کا تصور دوسری طرف انسان کی کم مائیگی کا احساس ایک دوسرے کی نفی کرتا ہے۔ صوفیوں کی تضاد بیانی میر کے یہاں بھی در آئی ہے۔ وہ جہاں انسان کی عظمت اور اس کے معیار کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

برسوں لگی رہتی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے

مت سہل ہمیں سمجھو پہنچے تھے بہم تب ہم
برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

وہیں یہ بھی کہتے ہیں ؎

سر کسو سے فرو نہیں آتا حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

یا روئے یا رُلا یا اپنی تو یوں ہی گزری
کیا ذکرِ ہم صفیراں یارانِ شادماں کا
ع کہیے تو میر بھی اک بُلبُلا تھا پانی کا

اس تضاد بیانی سے ان کے تصورِ عظمتِ آدم میں وہ استحکام نہیں پایا جاتا جو اقبال کے یہاں ہے۔ جس طرح اقبال نے فلسفۂ خودی، فلسفۂ حرکت وعمل تصورِ عشق و وجدان کے ذریعہ انسانی عظمت تک رسائی پانے کے لئے جو زینے بنائے ہیں اس طرح بتدریج ارتقاء میر کے یہاں مفقود ہے۔

گو میر نے صوفیوں کی طرح انسانی عظمت کے لئے انسان کی ذات کو خدا کی ذات میں ضم کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ پھر بھی میر کو انسان کے پردے میں خدا ہی نظر آتا ہے ؎

کھینچا ہے آدمی نے بہت دور آپ کو
اس پردے میں خیال تو کر ٹک خدا نہ ہو

یہی احساس ہے کہ وہ اپنی بے بسی اور ناکامی کے لئے خدا کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے یہ کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ ع

پردے میں بدسلوکی ہم سے خدا کرے ہے

اس طرح ایک طرف انھوں نے خدا کی منفی صفت بتلانے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ خدا کو بدلہ لینا مقصود ہے اس لئے اس نے یہ ڈراما رچایا ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ناکامی ہو۔ میر کو ایسے وقت انسان کی تخلیقی اور تسخیری صلاحیتوں کا احساس نہیں ہوتا ہے کہ کوشش وجہد اور حرکت وعمل سے انسان کیا کچھ نہیں کرسکتا۔ اقبال نے خدا کے تصور کو میر کی طرح مسخ نہیں کیا ہے کہ خدا جابر و قاہر

معلوم ہو اور انسان مظلوم و مجبور ظاہر ہو۔ اس معاملہ میں اقبال نے قرآن کریم کے اس ارشاد کو مانا ہے "عبودیت میں کامل ہو کر خدا کی ذات کو اپنی ذات میں سمو کر بندہ جو فعل کرتا ہے اس کے فعل میں اور خدا کے فعل میں کوئی فرق نہیں رہتا"۔ اس لئے اقبال ناامیدی کو کفر سمجھتے ہوئے کہتے ہیں ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امید مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

اقبال انسان کی فضیلت اسی میں ہی سمجھتے ہیں کہ وہ ماسوا کی تسخیر کرے اور ذاتِ مطلق کی خودی کو مسخر کر کے اپنا لے۔ گویا خدا تک رسائی حاصل کرے

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی

میر کا انسان فرشتہ سے برتر ہے۔ میر کو یہ احساس ہے کہ تخلیق صرف آدم ہی کی صفت ہے اور فرشتہ ان اوصاف سے مبرا ہے۔ انسان کے یہاں مسائل سے نمٹنے اور زندگی کا سامنا کرنے کا جو حوصلہ ہے وہ فرشتوں کے پاس نہیں پایا جاتا۔ فرشتے نسبتاً آسان زندگی گزارتے ہیں اور فرشتوں کا ماحول انسان سے بہتر ہے۔ اس لئے ان میں خوبیوں کا ہونا تعجب کی بات نہیں ہے۔ فرشتوں کا انسان سے بہتر ہونا البتہ مشکل اور دشوار ہے کیونکہ اس کے لئے جگر سوزی سے کام لینا پڑتا ہے۔

آدمی سے مَلک کو کیا نسبت
شان ارفع ہے میرؔ انساں کی

میر خودشناسی سے تو واقف ہیں لیکن اقبال کی طرح اس گُر سے واقف نہیں ہیں کہ خودشناسی سے خداشناسی تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟

البتہ ان کے یہاں ان خوبیوں کا اعتراف ہے جس سے نفس شناسی اور خودشناسی پیدا ہوتی ہے اور جس سے آدم کو جلا ملتی ہے اور خدائی کی شان ظاہر ہوتی ہے:

آدمِ خاکی سے آدم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا یہ ولے قابلِ دیدار نہ تھا

مرتے ہیں ہم تو آدمِ خاکی کی شان پر
اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پر

میرے مالک نے میرے حق میں یہ احسان کیا
خاکِ ناچیز تھا میں سو مجھے انسان کیا

میر کے تصورِ عظمتِ انسان کو اس نظریہ سے نقصان پہنچا ہے جس سے زندگی میں جبر و قہر نظر آتا ہے اور انسان کی معذوری و مجبوری جھلک پڑتی ہے۔ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں ؎

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا
خدائی صدقے کی انسان پر سے

وہیں شکستوں کا احساس، احتیاط اور تامل کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پرغرور تھا

اس احساسِ شکستگی کے باوجود میر کا انسان ارتقاء پذیر ہے۔ ڈاکٹر

سید عبداللہ نے میرؔ کے تصوّرِ آدم پر مبنی خیالاتِ پراگندہ کو یکجا کرتے ہوئے اس میں ایک تنظیم پیدا کی ہے۔ وہ اس تعلق سے رقمطراز ہیں کہ:

" انسان کی ماہیت اور اس کے ذہنی ارتقار و شرف کے بارے میں میرؔ کے خیالات کو مربوط کیا جائے تو انسان میں ایک خاص نظم پایا جاتا ہے۔ میرؔ نے انسان کو ایک ترقی یافتہ اور ترقی پذیر مخلوق قرار دیا ہے اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کا بھی اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ وارتقار میں انسان کی فطری بے بسی، بے چارگی اور سادہ دلی اور عجز کا اقرار کرتے ہوئے اس کی شرافتوں اور فضیلتوں پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان جب احساسِ خودی سے سرشار ہو جاتا ہے تو پھر اس کی نگاہ "یزداں شکار" اور "آسماں پیوند" ہو جاتی ہے۔ اسی کو میرؔ نے اپنی زبان میں انسان کی کبریائی کہا ہے۔ یہ کبریائی وہ نہیں جو خدا کا خاص ہے۔ یہ کبریائی وہ ہے جو صرف انسانِ مکمل کے مقدور میں ہے۔"

اس بیان میں ڈاکٹر عبداللہ نے انسانی کبریائی کی جو اصطلاح استعمال کی ہے وہ اس بات کی غماز ہے کہ میرؔ کا انسان کبھی خود کو خدا کے تسلّط سے آزاد کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی دنیا خود آباد کرنے کا متمنی ہے۔ وہ ایک ایسے انسانِ کامل کی تشکیل چاہتا ہے جس کی اپنی خدائی ہو

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدّعا ہوتے

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا یہ وے قابلِ دیدار نہ تھا

یہ مشتِ خاک یعنی انسان ہی ہے روکش
ورنہ اُٹھایا کس نے اس آسماں کی ٹکر

میرؔ کے یہاں جذبۂ عظمتِ آدم کو ان کے بے پایاں خلوص سے فروغ حاصل ہوتا ہے ۔ یہ ان کی انسان دوستی کا مظہر بھی ہے کہ ان کے پاس کائنات کی عظمت ضمنی ہے اور آدم کی عظمت کُلّی ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ فطرت وہ ذرائع پیدا کرتی ہے کہ انسان کی عظمت و فضیلت اُبھر کر سامنے آسکے ۔ بغیر کائنات کے انسان کو اپنے حوصلوں اور قوتِ ارادی کا احساس نہیں ہو سکتا ۔

میرؔ کے یہاں زندگی کا جبر اور انسان کی مجبوری کے ایسے عناصر شامل ہیں کہ وہ انسان کی عظمت کو دُھندلا دیتے ہیں جس سے اکثر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ میرؔ کائنات کی عظمت کو کلّی اور انسانی عظمت کو ضمنی سمجھتے ہیں ۔ اس لئے بھی ان کے قنوطی ہونے کا گمان ہوتا ہے ، اس جانب توجہ مبذول کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں :

" میرؔ کے یہاں زندگی کے جبر و قہر اور انسان کی معذوری و مجبوری کا جو تذکرہ ہے اس کی وجہ سے بعض لوگ میرؔ کو قنوطی کہنے لگے ہیں ۔ میرؔ نے زندگی کے جبر و قہر کا احساس رکھتے ہوئے بھی انسان کی عظمت کا ترانہ گایا ہے ۔ یہ جب نظر و مقدور

رکھتا ہے جس کے لئے برسوں مہر و مہ کی آنکھیں لگی رہی ہیں،
جو خاک کے پردے سے اس وقت نکلتا ہے جب فلک برسوں
گردش کر لیتا ہے، جو گرم سخن ہوتا ہے تو اس کے گرد ایک
خلق ہے اور جس کی خاموشی میں ایک عالم ہے نکلتا ہے۔"

"نقدِ ابوالکلامؒ کے مصنف نے اقبال کے یہاں انسان کی انا اور عظمت کو سمجھنے میں بڑی عجلت اور رواداری سے کام لیا ہے۔ کہیں تو ان کی اقبال بیزاری اور میر نوازی کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں اور کہیں ان کی جذباتیت حقیقت پر پردہ ڈالنا چاہتی ہے۔ ان کے یہ بیانات غور و اصلاح طلب ہیں اور اس منشار سے نقل کئے جا رہے ہیں کہ اس غلط فہمی کا ازالہ ہو۔

"اقبال کی انانیت میں جس حد تک برہمی اور بیزاری ہے
میر کی انانیت اس حد تک ہمیں بہلاتی ہے اور ہمارے
دلوں کو بستی بساتی ہے۔" (صفحہ ۸)

اقبال کی انانیت میں نہ آدم بیزاری ہے اور نہ خدا بیزاری۔ اس تصور سے اقبال کے تصورِ عظمتِ آدم میں کھنڈت پڑتی ہے۔ بلکہ یہ بیزاری اقبال کے تصور کی نفی کرتی ہے۔ میر کی انانیت میں بہلانے سے کہیں زیادہ جارحانہ عمل ہے البتہ اس انانیت میں کہیں کہیں آدم بیزاری اور خدا بیزاری بھی موجود ہے۔ اقبال کی انانیت میں برہمی نہیں بلکہ مثبت قوتِ عمل ہے، تجسس، جہد اور عقدہ کشائی ہے۔

"میر کی انانیت کا رُخ اقبال کی خودی سے کسی حد تک جُدا ہے
وہ خدا کی طرف نہیں بلکہ انسان کی طرف مائل ہے۔" (صفحہ ۹)

اقبال کی خودی کا تعلق جتنا انسان سے ہے اتنا خدا سے نہیں ہے پہچانِ نفس، اطاعتِ نفس اور ضبطِ نفس اور انسانِ کامل کی منزلیں راست انسان ہی سے تعلق رکھتی ہیں البتہ انسانی خودی کا کمال ہے کہ وہ خدا کی خودی کو مسخر کر کے اپنا لے جبکہ انسانی خودی کا بتدریج ارتقاء میر کے یہاں مفقود ہے اور ان کی خودی مبہم اور غیر واضح ہے۔ اور کبھی کبھی عظمتِ آدم کی نفی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔

"اقبال نے صفاتِ خداوندی کے سہارے انسانی خودی کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے عظیم الشان ہونے میں شبہ نہیں ..... مگر یہ تصور ہے تصویر نہیں۔ میر کی انسانیت خودی کی ایسی موہنی تصویر بن گئی ہے کہ فطرت کا ابہام اس میں حل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔"

(نقد ابو الکلام ص ۸۰)

اقبال کے تصورِ خودی کی عملی صورت گری ان لوگوں کے لئے تصویر نہیں رہ جاتی جن میں جذبۂ عمل اور جذبۂ تسخیر کارفرما ہوتا ہے ہاں کاہل وسُست کے لئے وہ تصویر ہی رہے گی کیونکہ وہ اس تک پہنچنا نہیں چاہے گا۔ دوسرے خودی کوئی ساکت وجامد نہیں جس کو ہم تصویر سے تعبیر کریں اور پھر ایسی ساکت وجامد شئے سے فطرت کا ابہام کیسے دُور ہو سکتا ہے جبکہ میر تصوّر خانۂ دنیا میں محوِ حیرت ہیں جبکہ اقبال خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

غالبؔ اور عظمتِ آدم

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جُز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے

غالبؔ نے ان اشعار میں عظمت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ان کی فکر کی بلندی اور تخیّل کی پرواز پر دلالت کرتا ہے لیکن عظمتِ آدم جس جذبۂ عمل اور عشق و وجدان سے حاصل ہوتی ہے اس جانب سے غالبؔ نے اغماض برتا ہے اور اپنے احساسِ شگفتگی کے لئے تخیل اور فکر کو بدرقہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ دُنیا کو اُنھوں نے بازیچۂ اطفال جانا ہے جہاں نِت نئے تماشے ہوتے رہتے ہیں اور دنیا کا وہ پہلو چھُپ گیا ہے جو حرکت و عمل سے عبارت ہے اور جہاں انسان تماشائی نہیں رہتا

بلکہ دنیا کے ہنگاموں میں شریک ہوجاتا ہے۔ اورنگ وسلیماں ان کے لئے یوں بھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فکر و تخیل کی پرواز اس سے بلند ہے اور اعجازِ مسیحا ایک بات سے زیادہ اہمیت اس لئے نہیں رکھتی کہ ان کے کشتۂ فکر سے تو سب ہی جلا پاتے ہیں۔ غالب نے اپنی شکستگی پر فکر و تخیل کا جو خول چڑھایا ہے وہ آگے چل کر ٹوٹ جاتا ہے اور جو غالب ؎

جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جُز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے

کہتا ہے وہی غالب یہ کہنے پر آمادہ ہوجاتا ہے: ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالَم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

دنیا کو حلقۂ دامِ خیال تصوّر کرنا اور انسان کو محشرِ خیال جاننا، در اصل حرکت و حیات سے اغماض اور تلاش و جستجو سے اجتناب برتنا ہے۔ اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے اسلوب احمد انصاری نے لکھا ہے:

"وہ خود بھی ذہنی دنیا میں رہتے تھے۔ مادہ اور خیال کے تقدم و تاخر کے سلسلہ میں وہ خیال ہی کی اولیت اور سبقت کو تسلیم کرسکتے ہیں۔ جدید ترین نقطۂ نظر جو جدلیاتی مادیت میں یقین رکھتا ہے ان کے قیاس میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے برکلے اور اسپنوزا کی طرح وہ یہی سوچ اور کہہ سکتے تھے کہ محسوساتِ مادی در اصل خیال ہی کی معجز نمائی کا عکس ہیں۔"

غالبؔ کے برعکس اقبالؔ نے انسان کی عظمت کو بڑھاتے ہوئے کہا ہے ؎

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

ویسے غالبؔ عظمتِ آدم کا اسلامی تصور بھی رکھتے ہیں اور وہ انسان کو فرشتوں پر ترجیح بھی دیتے ہیں اور یہ تسلیم بھی کرتے ہیں کہ کائنات کی وجہ تخلیق آدم ہے۔ انسان کا تجسّس اور افشائے راز کی خداداد صلاحیت اس کو زمین تک ہی نہیں آسمان تک کا محرک بنا دیتی ہے ؎

رشکِ ملک چہ و حرا چوں بتو رہ نمی برد
بیہدہ در ہوائے تو می پرواز سُبک سری
ز آفرینش عالمَ غرض جز آدم نیست
بگردِ نقطِ ما دور ہفت پرکار است

غالبؔ عظمتِ انسانی کے لئے ان فرسودہ روایات کو خیرباد کہنا چاہتے ہیں جہاں انسان کو پابند ہونا پڑتا ہے۔ وہ فطرت کے جلووں اور مظاہر سے لطف اندوز ہونے کے لئے آزادی اور یکسوئی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ فطرت کے جلووں کی کوئی انتہا نہیں ہے اور نہ وہ وقت اور پابندی کے محکوم ہو سکتے ہیں۔ غالبؔ کے یہاں ایک طرف فطرت کے جلووں سے لطف اندوز ہونے کی خواہش ہے تو دوسری طرف ان جلووں کا عقلِ انسانی کو حیران کرنا ہے ؎

نہ ہوگا یک بیابانِ ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

فطرت، مظاہر کو افشار کرنے میں، علم کو وسعت دینے میں، تخلیقِ انسانی کو بڑھاتی ہے اور پھر انسان علم کا ایک سمندر پی کر قوتِ تخلیقِ انسانی کو ظاہر کرتا ہے۔ خدا کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ یہاں غالب کا انسان اقبال کی طرح ؎

یا خود کو آشکار کر یا مجھے آشکار کر

نہیں کہتا بلکہ وہ دستِ سوال دراز کرکے انسانی عظمت کو ٹھیس پہنچاتا ہے ؎

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنا ہیں
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

غالب کا انسان اپنے اندر بے پناہ خواہشات رکھتا ہے۔ اس کے پاس خواہشات کا لامتناہی تسلسل ملتا ہے اور پھر اس کو اپنی ہر خواہش عزیز تر ہے، وہ کسی خواہش کو رد نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی خواہشات وقتاً فوقتاً پوری ہوتی رہتی ہیں لیکن زیرِ تکمیل خواہش اس کو چین لینے نہیں دیتی۔ کبھی تو وہ دو جہاں مانگ کر بھی دستِ سوالی بن جاتا ہے۔ اقبال کی طرح غالب کا انسان یہ کہہ کر اپنی عظمت کو نہیں بڑھاتا

کہ ؎
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

اس سے انکار نہیں کہ غالبؔ کا انسان جادہ پیمائی پر بھی آمادہ ہے لیکن دنیا سے اس کا تعلق اِتنا اٹوٹ نہیں ہے جتنا اقبالؔ کے انسان کا اٹوٹ ہے۔ دنیا تو اس کے پاس دشتِ امکاں کا ایک نقشِ پا ہے۔ اس کی صراحت کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ایک جگہ لکھا ہے:

"غالبؔ کہتے ہیں کہ دشتِ امکاں جس میں فطرت اور معاشرہ دونوں شامل ہیں زندگی کے دائمی سفر میں نقشِ پا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ تخلیق کی تمنّا کا قدم ہمیشہ آگے بڑھتا ہے لیکن غالبؔ تحیّر کی حالت میں پوچھتے ہیں کہ اس عالم کے بعد نفسِ انسانی کا دوسرا قدم کس عالم میں پڑے گا۔ چونکہ غالبؔ نظری طور پر وحدت الوجود کے قائل تھے اس لئے ہستی کی نفی کرتے تھے لیکن ان کے شوق اور تمنّا کے تصوّرات انسان کی دائمی ذہنی اور جذباتی تخلیق کو اُجاگر کرتے ہیں۔"

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

غالبؔ نے مسئلہ وحدت الوجود سے انسان کی ذات کو خدا کی ذات میں ضم کر کے اس کی عظمت کو بلند کرنے کی جو کوشش کی ہے، اس کے پس پردہ انسان کی عظمت متاثر ہونے لگتی ہے اور شانِ انسانی باقی نہیں رہتی ہے جو اقبالؔ کے یہاں ہے۔ یہ مسئلہ وحدت الوجود دوسری

طرف انسان کی کم مائیگی پر دلالت کرتا ہے جہاں فرد اپنی انفرادیت کھو دیتا ہے ؎

دل کا ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالبؔ کا انسان زمانے سے مات کھا جاتا ہے۔ زمانہ کبھی اس کے لئے ناقابلِ فتح اور کبھی حریف ہے۔ وہ خدا سے شکایت کرتے ہیں کہ زمانہ ان کو لوحِ زمیں پر حرفِ مکرّر سمجھ کر مٹا رہا ہے حالانکہ وہ حرفِ مکرّر نہیں ہیں۔ ان کی ایک انفرادیت ہے جو یہ کہتی ہے کہ ہم کو تقلید تنک ظرفی منظور نہیں جبکہ اقبالؔ کا انسان نہ زمانے کے زیرِ اثر آتا ہے اور نہ ہی زمانے کو حریف سمجھتا ہے۔ وہ زماں و مکاں کا پابند نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا آزاد انسان ہے جو زماں و مکاں سے پرے جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اقبالؔ کہتے ہیں ؎

وہی اصلِ مکانِ لامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے اندازِ بیاں ہے
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

غالبؔ کے یہاں معرفتِ نفس شکستِ انا کا ایک ذریعہ ہے۔ جب

"میں" کا احساس ختم ہو جاتا ہے تو اس کے شعور اور ادراک کو تقویت ملتی ہے۔ غالبؔ کا "میں" اقبالؔ کی "انا" نہیں ہے بلکہ غرور و تکبر ہے جس کی شکست سے مسائل کو حل کرنے میں یکسوئی پیدا ہو سکتی ہے اور راہ کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ غالبؔ کی "انا" غرور و تکبر کے لغوی معنی تک محدود ہے۔ جبکہ اقبالؔ نے اس کو پہچانِ نفس سے تعبیر کیا ہے جس سے صلاحیتیں آشکار ہوتی ہیں۔ غالبؔ نے اپنے "میں پن" کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہا ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالبؔ کے یہاں "میں" ایک روڑا بن جاتا ہے جو ان کی شخصیت کو اُبھار نہیں سکتا۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو سعیِ لاحاصل میں بھی لذت حاصل ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو فریب دینے لگتے ہیں اور اپنی ناکامیوں کو بہلانے لگتے ہیں ؎

بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

اقبالؔ نے عشق سے وہ مراد نہیں لی ہے جو غالبؔ اور دوسرے شاعروں نے مراد لی ہے۔ اقبالؔ کا عشق انسان کو منزل شناس کرتا ہے اور غالبؔ کا تصورِ عشق انسان کو بہکاتا اور بھٹکاتا ہی نہیں بلکہ نکما بنا دیتا ہے ؎

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عشق کی ایک جست نے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

غالبؔ کا تصورِ عظمتِ آدم حسّیات پر مبنی ہے اور یہ حسّی تجربات جا بجا منتشر اور بکھرے ملتے ہیں۔ ان میں مماثلت بھی ہے اور تضاد بھی، رنگینی بھی ہے اور بے رنگی بھی۔ اقبالؔ کی طرح ان کے یہاں تصوّرِ عظمتِ آدم میں مربوط، معیّن اور مسلسل نظام نہیں ملتا جو شیرازہ بندی کر سکے۔ اور اس طرح انسان کو پراگندگی اور انتشار سے نکال سکے تاکہ وہ خود اپنی تلاش کر سکے۔ اقبالؔ کے انسان نے خود کو پا لیا ہے جب کہ غالبؔ کا انسان اکثر حیلہ حوالے اور شکوہ و شکایت سے نہیں نکل پایا ہے ۔

گِلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہُر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یاس یگانہ اور عظمتِ آدم

اقبال کی طرح یگانہ بھی عظمتِ آدم کے قائل ہیں اور کسی حال میں عظمت کو کھونا نہیں چاہتے ہیں۔ جب بھی ان کی انسانی عظمت متاثر ہوتی ہے وہ جھنجلانے لگتے ہیں اور تخریب کاری کی بھی سوچنے لگتے ہیں تاکہ چنگیزیت سے مخالف ہواؤں کو روکا جائے۔ اقبال کی طرح یگانہ کے پاس کوئی ایسا ضابطہ یا فلسفہ نہیں ہے جو دنیا میں انسان کے مرتبہ کو بلند کر سکے۔ یگانہ کا انسان تنہا اور معاشرے سے کٹا ہوا ہے جبکہ اقبال کے یہاں انسان کو اپنی تنہائی اور بے سروسامانی کا احساس نہیں ہے۔ اقبال کے انسان کا اس کے معاشرے سے گہرا تعلق ہے۔۔ اقبال کے یہاں فرد کی خودی سے اجتماعی خودی تشکیل پاتی ہے۔ فرد کی عظمت سے ہی نوع آدم کی عظمت کا تصور جاگتا ہے۔ یہ ایک وسیع اور واضح تصور ہے جس کے تانے بانے ملتے اور پھیلتے جاتے ہیں

یگانہ کے یہاں کٹے ہوئے انسان کا تصوّر سماجی جبر کی وجہ سے آیا ہے۔ چونکہ ایک زمانہ ان کا دشمن ہوگیا تھا اس لئے انھوں نے زمانے کی پروا نہیں کی، سماج کے آگے نہیں جھکے۔ ان کے اندر کا چھپا ہوا انسان جھکنا اور دبنا نہیں جانتا تھا۔ ان کے یہاں انسان ضد اور اکڑ فوں سے عظمت منوانا چاہتا ہے۔ اُن کے یہاں انسانی عظمت کے محلات ضد، ہٹ دھرمی، اکڑ فوں کی بنیادوں پر ہی کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کا انسان نہ تو زمانے کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ ہی زمانے کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ان کے یہاں ایک بانکے کی کج روی ملتی ہے۔ یگانہ کسی سے صلح کرنا نہیں جانتے۔ اس ہٹ دھرمی اور اکڑ فوں سے ان کے یہاں تنہائی کا احساس بھی آیا اور خود کلامی کے عناصر بھی داخل ہوئے ہیں۔

یگانہ کا انسان اپنی عظمت کو ایک حصار میں بند کر کے منوانا چاہتا ہے۔ وہ ہر آن اور ہر قدم سماج اور زمانہ کے دوبدو نہیں آتا، البتہ کبھی کبھی وہ اس حصار کو توڑتا بھی ہے۔ کبھی تو وہ ایک خاص فاصلے سے سماج اور زمانہ کو بُرا بھلا کہتے ہوئے ان کی ناقدری پر نالاں نظر آتا ہے اور کبھی خم ٹھونک کر نکل بھی جاتا ہے کہ دیکھیں زمانہ کیا کرتا ہے البتہ یگانہ کا انسان اپنی صلاحیتوں اور مقدر سے مایوس نہیں ہے، وہ بادِ مخالفت میں بھی تن کر اور جھوم کر گزر جاتا ہے۔ یگانہ کے انسان میں جرأت ہے لیکن وہ ثبات و استحکام نہیں ہے جو اقبال کے انسانِ کامل میں ہے۔ اقبال کا انسانِ کامل جن اوصاف سے متصف ہوتا ہے، اور جس مسلک کو اپناتا ہے وہ یگانہ کا انسان اپنا نہیں سکتا۔ یگانہ کا انسان، انسانی اوصاف سے کہیں زیادہ ابلیسی اوصاف رکھتا ہے اور وہ

ابلیس کی طرح جھکنا اور ہار ماننا نہیں چاہتا اور خاص کر ابلیس کی تخریب کاری بھی اس کے پاس آگئی ہے۔

یگانہ کے انسان کی نگاہ بلند ہے لیکن اس کا سخن دل نواز نہیں ہے۔ وہ دل موہ لینے کی بجائے دل توڑنا جانتا ہے۔ اس کا یقین اتنا محکم نہیں ہے جتنا اقبال کے انسان کا ہے۔ یگانہ کا انسان اپنے مقام کے لئے کوشش و جہد تو بہت کرتا ہے لیکن وہ عملِ پیہم نہیں ہے جو انسان کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔ یگانہ کا انسان خلوص و محبت کے ذریعہ فاتحِ عالم نہیں ہو سکتا۔ وہ دُوری اور دوئی کی اُلجھنوں میں گرفتار ہے۔ اس کا کوئی ہم نوا نہیں ہے۔ یگانہ کے انسان کو اپنے مونس، ہمدم اور ہم نوا کی تلاش ہے۔ جب کبھی وہ کسی سے دو بول اپنی تائید میں سُنتا ہے تو بس اس سے قریب ہونا چاہتا ہے۔ وہ محبت و خلوص کا بھوکا ہے اور وہ دوسروں کو بھی خلوص و محبت کے جام دینا نہیں چاہتا ہے۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے اقبال اور یگانہ کے انسان میں فرق و تمیز کرتے ہوئے لکھا ہے :

"اقبال اور یاس دونوں ہی فرد کو ایک مکمل اکائی ماننے والے شاعر ہیں لیکن اقبال کا مردِ مومن یاس کے فردِ واحد سے بہت مختلف ہے۔ اقبال نے اپنے مردِ مومن کے لئے دنیا بھر کی صفات سے خمیر تیار کیا۔ اقبال کا مردِ مومن، اقبال ہی نہیں ہے بلکہ اقبال کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ لیکن یاس کا فردِ واحد یاس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ انھوں

نے اپنے فرد کی تخلیق اپنے سانچے پر کی، اس لئے ان کے فرد میں وہ تمام اچھائیاں اور برائیاں موجود ہیں جو خود ان کی شخصیت میں تھیں۔ یوں یاسؔ کا فردِ اقبالؔ کے مقابلہ میں زیادہ زندہ معلوم ہوتا ہے لیکن وہ اقبالؔ کے مردِ مومن کے مقابلہ میں پست درجے کا انسان ہے یاسؔ کا فرد جھوم کر یہ نہیں کہہ سکتا ؏

سخنے نہ گفتہ راچہ قلندرانہ گفتم

یاسؔ کے فرد کو یہ قلندری نہیں ملی۔ وہ اقبالؔ کے مردِ مومن کے مقابلے میں اقبالؔ کے ابلیس سے زیادہ قریب ہے۔"

اقبالؔ کا انسان دنیا کو ہم نوا بنا سکتا ہے اور دنیا کو تسخیر کر سکتا ہے جبکہ یگانہ کا انسان نہ تو زمانے کو ہم نوا بنا سکتا ہے اور نہ ہی دنیا کو تسخیر کر سکتا ہے البتہ وہ تسخیر کی کوشش کر کے تھک ہار جاتا ہے۔ لیکن اپنی ہار کو نہیں مانتا۔ وہ تو چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی کہتا ہے اور اس طرح اپنا بھرم رکھ لیتا ہے۔

یگانہ کا انسان ایک COMPLEX میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی تضحیک کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی عظمت کو منوانے کے لئے اپنے منہ میاں مِٹھو بن جاتا ہے۔ کبھی تو وہ اپنے آپ کو غالب شکن کہہ کر تسکین دیتا ہے کبھی خود کو امام الغزل، ابوالمعانی تو کبھی شہنشاہ بنی آدم اور یگانہ علیہ السلام کہہ کر خوش ہو لیتا ہے۔ وہ تن کر، اینٹھ کر، اکڑ کر اور اِترا کر اپنا مقام بنانا چاہتا ہے جبکہ اقبالؔ کا انسان خود شناسی سے اپنا مقام بناتا

بنانا چاہتا ہے۔ اقبال کے انسان میں احساسِ خودی سے عظمتِ انسانی جاگتی ہے۔ عشق و وجدان اور حرکت و عمل سے وہ اپنی عظمت منواتا ہے جبکہ یہ بصیرت یگانہ کے پاس مفقود ہے۔

نمونۂ کلام یاس یگانہ چنگیزی ...

★ خودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ، مگر بنا نہ گیا

★ چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے
میں کہاں ہار ماننے والا

★ آندھیاں رکیں کیونکر، زلزلے تھمے کیونکر
کارگاہِ فطرت میں پاسبانیٔ رب کیا

★ ہنوز زندگیٔ مئے تلخ کا مزہ نہ ملا
کمالِ ضبط ملا، صبر آزما نہ ملا

★ مجھے اے ناخدا، آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے مجھ کو پار اُتر جانا نہیں آتا

★ مصیبت کا پہاڑ آخر کو اک دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشہ سے مر جانا نہیں آتا

★ اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم، گھر کا راستہ نہ ملا

★ خود اپنی آگ میں جلتا تو کیمیا ہوتا
مزاج داں نہ تھا پروانہ شمعِ محفل کا

★ لہو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا

★ بندۂ خود شناس ہے اپنے ہی پیرہن میں مست
بوئے خودی کو بخش کیا سجدہ گہِ ایاز میں

★ میں کہاں اور کہاں کے پست و بلند
ایک ٹھوکر میں تھا بکھیڑا پاک

★ دلِ طوفاں شکن تنہا جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے

★ ناخدا کچھ زورِ طوفاں آزمائی بھی دکھا،
فکرِ ساحل چھوڑ لنگر ڈال دے منجدھار میں

★ انساں کو رہے حفظِ مراتب کا بھی کچھ دھیان
کیوں اس سے ملا پاس جو جھک کر نہیں ملتا

★ خودی پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاس کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

★ ننگِ محفل مرا زندہ، مرا مُردہ بھاری
کون اُٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

★ ٹکرا کے دیکھیں، تم کیا ہو ہم کیا
جیتے تو جیتے، ہارے تو ہارے

★ بے نیازی کی کوئی حد بھی ہے آخر کب تلک
ہاتھ اٹھاؤ بھی کہیں یاس منا جاتوں سے

★ نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر اسے عیب جانئے یا بہتر
وہی بات آئی زباں پر جو نظر پہ چڑھ کے کھری رہی

★ کیسے کیسے خدا بنا ڈالے
کھیل بندوں کا ہے خدائی کیا

★ ہاں کیوں نہ پار اُتر چلوں خمیازہ جھیل کر
ڈوبے مری بلا سے عرق انفعال میں

★ جو خاک کا پُتلا وہی صحرا کا بگولا
مٹنے پہ بھی اک ہستی برباد رہے گی

★ شیطان کا شیطان فرشتہ کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

★ منزل کی دُھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے
شورِ جرس سے دل نہ رہا اختیار میں

★ دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

★ پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف
کون اب بھی ہوسِ بانگِ درا کرتے ہیں

★ دن کو دن سمجھے اور نہ رات کو رات
وقت کی قدر جاننے والا

★ کوئی بندۂ عشق ہے، کوئی بندہ عقل کا
پاؤں اپنے ہی نہ تھے قابل کسی زنجیر کے

★ دلِ آگاہ نے جب راہ پہ لانا چاہا
عقلِ گمراہ نے دیوانہ بنانا چاہا

★ ہلنے کے نہیں اپنی جگہ سے کبھی یاسؔ
ہٹتے نہیں جب بات پہ اَڑ جاتے ہیں

★ بڑھ گئی قیدِ خودی سے اور اک قیدِ فرنگ
آزماتے ہیں وہ اب طوق و سلاسل سے مجھے

★ بندے نہ ہوں گے جتنے خدا ہیں خدائی میں
کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی

★ عجب کیا ہے ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے
زمانے کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا

★ باز آ ساحل پہ غوطہ کھانے والے باز آ
ڈوب مرنے کا مزہ دریائے بے ساحل میں ہے

★ زمانے پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے،
دکھا وہ زور کہ دنیا میں یادگار رہے

★ دل جلا کر وادیٔ غربت کو روشن کر چلے
خوب سوجھی جلوۂ شامِ غریباں دیکھ کر

★ خضرِ منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

کیا بتاؤں کیا ہوں میں، قدرتِ خدا ہوں میں
میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے

✦ ان عقل کے اندھوں میں ہے یہ غل کیسا
میں جزو ہوں وہ کُل یہ تعقل کیسا؟
کُل ہی کُل ہے کہاں کا جُزو کیسا جزو
کُل جز سے الگ ہوا تو پھر کُل کیسا

✦ یارانِ چمن یہ رنگ و بُو مجھ سے ہے
تم سے کیا ہوگا لکھنؤ مجھ سے ہے
میں جانِ سخن ہوں بلکہ ایمانِ سخن
دنیائے ادب کی آبرو مجھ سے ہے

✦ تمہاری جیت تو جب تھی دلوں میں گھر کرتے
زباں سے ہار نہ مانیں گے ہارنے والے

✦ صبر کرنا سخت مشکل ہے تڑپنا سہل ہے
اپنے بس کا کام کر لیتا ہوں آساں دیکھ کر

✦ ارے وہ جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا
یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہو کر

✦ دل جلا کر وادیٔ غربت کو روشن کر چلے
وہی اب خون کی پیاسی ہوئی ہے کربلا ہو کر

✦ پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف
کان اب تک ہوسِ بانگِ درا کرتے ہیں

★ ہاں وسعتِ زنجیر تک آزاد ہوں میں بھی
ہستی مری مجموعۂ اضداد رہے گی

★ گرم رفتاری پہ گمراہوں کو کیا کیا ناز ہیں
کون سمجھے یہ دلِ آگاہ کس منزل میں ہے

★ رفتارِ زندگی میں سکوں آئے کیا مجال
طوفاں ٹھہر بھی جائے تو دریا بہا کرے

ابوالکلام آزاد اور عظمتِ آدم

عظمتِ آدم کو اقبال اور ابوالکلام آزاد دونوں نے مانا اور منوایا ہے یوں تو دونوں کے یہاں عظمتِ آدم کا ماخذ قرآن حکیم ہے مگر اس تصوّر میں دونوں بڑی حد تک مماثلت رکھتے ہوئے بھی فرق محسوس کرتے ہیں۔ اقبال نے قرآن اور اسلام پر ہی تکیہ نہیں کیا بلکہ دوسرے مفکّروں، عالموں اور مذاہب کے خیالات سے استفادہ بھی کیا ہے۔ ان کے یہاں عظمتِ آدم کے تصوّر میں چند ایسے عناصر بھی کارفرما نظر آتے ہیں جو مغرب سے دبے پاؤں آگئے ہیں جبکہ ابوالکلام آزاد کے یہاں مئے عظمتِ انسانی خالص حجازی ہے جس میں مغربی رنگ و بو بھی شامل نہ ہوسکی اور جس کے لئے آزاد نے احتیاط بھی برتی ہے۔ آزاد کے یہاں خالص قرآنی اور اسلامی تصوّرِ عظمتِ آدم کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ فطرتاً ایک مفسّر تھے۔ اس لئے از روئے قرآن کائنات، فطرت اور انسان کے درمیان ایک واسطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر مفسّر کی حیثیت سے

انھوں نے انسان کی نیابت کو مانا ہے اور اس کے اشرف و افضل ہونے کی تصدیق کی ہے اور آدم کی عظمت کے لئے مشیتِ ایزدی کا احترام ضروری جانا ہے۔ ان کے یہاں آدم کی عظمت اس کی سرکشی میں نہیں ہے بلکہ رضائے مولا اور صلاحیتِ انسانی اور مسلکِ انسانیت میں مضمر ہے آزاد کا انسان بغاوت نہیں کرتا بلکہ خدا کی خوشنودی حاصل کرکے ہی عظمت کے مدارج طے کرتا ہے۔

آزاد نے فطرت، کائنات اور انسان کو قرآن کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھا ہے جبکہ اقبال کبھی کبھی اس سے باہر نکل آتے ہیں۔ وہ اس مقام کو اہمیت دیتے ہیں کہ خدا خود بندے سے پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ مشیتِ ایزدی کے ساتھ ساتھ مرضیِ انسانِ کامل بھی خدا اور بندے دونوں کے لئے لازم و ملزوم قرار پاتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف خدا کا بندے کو عزیز رکھنا اور دوسری طرف بندے کا خدا سے تعلق رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اقبال کے یہاں انسان میں وہ جرأت ہے جو اس کو خدا سے ہمکلام ہونے پر اُکساتی ہے۔ وہ نہ تو جذبۂ عشق کی خامی ہے اور نہ ہی خدا سے بغاوت کو ظاہر کرتی ہے بلکہ عشق کی وہ کیفیت ہے جہاں گلے شکوؤں کو سُنا جاتا ہے۔ وہ تلخ نوائی بھی ہے جو کسی کو اپنا سمجھ کر اپنائی جاتی ہے۔ اقبال کے یہاں خدا قطعی انسان کا رقیب نہیں ہے۔ کیونکہ اقبال نے خدا کی خودی کو مسخر کرکے اپنا لینے کے لئے کہا ہے۔ اکثر اس بات کو رقابت اور سرکشی جانتے ہوئے اسے رقابت اور سرکشی پر محمول کرتے ہیں۔" تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ میں بھی اقبال نے صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

اگر انسان اپنی ذات کی وسعتوں اور گوناگوں صلاحیتوں کو ترقی نہ دے تو وہ بے حس و بے جان پتھر بن کر رہ جائے گا۔ آزاد نے بھی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسان جستجو و تحقیق سے باز نہیں آتا۔ وہ کائنات کے راز اور زندگی کی حقیقت کو جاننا چاہتا ہے۔ وہ فطرت تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے سرگرداں ہے اس کی یہ جہد اور اس کی یہ سعی اس کو رفعتوں سے ہمکنار کرتی ہے۔

ابو الکلام آزاد اور اقبال کے یہاں عشق خداوندی کے مدارج کچھ الگ ہیں۔ آزاد کا انسان فطرت سے ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے عشق خداوندی میں مبتلا ہو جاتا ہے جبکہ اقبال کا انسان عشق خداوندی میں مبتلا ہو کر بے باک ہو جاتا ہے۔ ان دونوں کے پاس عشق خداوندی ضرور اور لازم ہے۔ آزاد کا انسان خدا سے بات بھی کرنا چاہے گا تو دبی دبی زبان میں بات کرے گا اور اس کی آواز بلند نہیں ہو پائے گی جبکہ اقبال کا انسان عشق خداوندی میں بے تکلف ہی نہیں بلکہ گستاخ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی یہ گستاخی ایک عاشق کی گستاخی ہی رہتی ہے۔

یہ کہنا کہ اقبال کے یہاں انسان کی عظمت میں جلال اور آزاد کے یہاں جمال ہے بڑی حد تک تو صحیح ہے لیکن کلّی طور پر درست نہیں ہے اقبال نے انا، خودی اور عظمت کی تشکیل صرف جلال سے ہی نہیں کی بلکہ اس میں جمال بھی شامل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں کہیں انسان کا جلال چونکاتا ہے جبکہ ان کے یہاں انسان کا جمال اُبھر کر نہیں آتا۔

ابو الکلام آزاد "تذکرۂ قرآن" میں رقمطراز ہیں:

"وجودِ انسان کرۂ ارضی کے سلسلۂ خلقت کی آخری اور

اعلیٰ ترین کر دی ہے۔ اگر پیدائشِ حیات سے لے کر وجودِ انسانی کی تکمیل تک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ایک ناقابلِ شمار مدت کے مسلسل نشوونما کی تاریخ ہوگی۔ گویا فطرت نے لاکھوں، کروڑوں برس کی کارفرمائی و صناعی سے کرۂ ارضی پر جو اعلیٰ ترین وجود کیا ہے وہ انسان ہے۔"

آزاد کے اس حوالے سے جہاں انسان کی عظمت واضح ہوتی ہے وہیں اس کی نشوونما کی صلاحیت بھی آشکار ہو جاتی ہے۔ آزاد نے اپنے خطبات میں بھی اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ انسان اپنی اس صلاحیت اور قوت کو جانے اور پہچانے جو خدا نے اس میں ودیعت کی ہے۔ اور جو طوفان و حوادث کا سامنا کرنا جانتی ہے اور جس کے عزائم اور حوصلے بلند ہوتے ہیں۔

بعض نقادوں نے اقبالؔ کے پیام کو پیامِ خودی اور آزاد کے پیام کو پیامِ خودشناسی سے تعبیر کیا ہے جن کا مسلک ایک ہی ہے لیکن طریقۂ کار جُدا ہے۔ یہ شکایت کہ اقبال کا پیامِ خودی مسلمانوں تک محدود ہے جبکہ آزاد کی خودشناسی اس فرق و امتیاز سے بالاتر ہے دراصل اقبال کے تصورِ مردِ مومن سے پیدا شدہ غلط فہمی کو ظاہر کرتی ہے۔ اقبال نے انسانی عظمت کا نمونہ مردِ مومن کی صورت میں، جو بتلایا ہے اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ مردِ مومن کو عقیدۂ توحید سے تقویت ملتی ہے، اور اس کا فقر اس کے غیر اللہ کے سامنے جھکنے نہیں دیتا۔ اور پھر مردِ مومن ایک مثال ہے

مردِ مومن جیسی صفات دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں بھی پیدا ہوسکتی ہیں۔ آزاد کی خود شناسی انسان کو اس کی عظمت کا احساس تو دلاتی ہے لیکن اس میں وہ تیزی اور حرکت نہیں ہے جو اقبال کے یہاں نظر آتی ہے۔

اقبال اور عظمتِ آدم

انسان کی سرشت میں کائنات پر چھا جانے اور اپنا مقام بنانے کا جذبہ اور دوسرے جذبات پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کو اس بات کا علم ہے کہ وہ مسخّر کائنات ہے۔ وہ اسرارِ کائنات اور ممکناتِ حیات کو اپنی صفات اور جوہر سے وجود میں لا سکتا ہے اور اسرار کو فاش کر سکتا ہے اس کی زندگی کا منشار و مقصد ہی اپنی جہد و سعی سے ممکنات کو وجود میں لانا ہے۔ ماسوار کی تسخیر ہی آدم کے مقام کو بلند کر سکتی ہے ورنہ خود مسخّر ہو جائے تو وہ مقام و مرتبہ کھو دے گا جو اس کو حاصل ہے۔ اس کے تسخیر کی حد یہ ہے کہ وہ ذاتِ مطلق کی خودی کو مسخّر کر کے اپنائے۔ اور اپنی خودی کو خدا کی خودی سے ہم آہنگ کرے ؎

فطرت کو خرد کے روبرو کر
تسخیرِ مقامِ رنگ و بُو کر

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

آدم کی طبیعت نے قید و بند کو گوارا نہ کیا اس لئے کہ وہ پابندیوں سے آزاد ہونے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس کی ذات آزادانہ فضا ہی میں پروان چڑھ سکتی ہے چنانچہ آغازِ آفرینش سے ہی آدم قید و غلامی کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ فردوسِ گمشدہ اور ہبوطِ آدم کا قصہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قید و بند سے اس نے چھٹکارا پاتے ہوئے مشیتِ ایزدی کا خیال نہ رکھا، اور شجرِ ابدیت کے ثمرِ ممنوعہ کو کھایا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو جنت چھوڑنی پڑی۔ اقبال نے آدم کی اس پہلی غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ آدم کا شعور اور خود آگاہی کی جانب پہلا قدم تھا کیونکہ جستجوئے علم کی خواہش نے اس کو اس اقدام پر مجبور کیا تھا۔ انسان کی فطرت میں تحقیق و جستجو کے جو عناصر پوشیدہ تھے اس پر آشکار و عیاں ہوئے اور آدم کو خودی کا احساس ہوا اور اس نے جانا کہ خودی کی بقا، و ترقی کے لیے علم، افزائش اور طاقت کے حصول کی جستجو ضروری ہوتی ہے۔

چونکہ انسان کی فطرت میں جلد بازی، بے چینی اور اضطرابی کیفیت پنہاں ہے اس لئے قدرت نے اسرارِ کائنات کو اس سے پوشیدہ رکھا تھا تاکہ شعور و آگاہی کے بعد ہی اسرارِ کائنات اس پر مرتفع ہو سکیں جو غلطی آدم سے سرزد ہوئی اور جس کے اظہارِ ندامت پر خدا نے اسے معاف کیا اور اس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا اور اس کو دنیا میں بھیجا۔ اس ہبوطِ آدم کے واقعہ کو دوسرے مذاہب میں اس طرح پیش کیا گیا ہے

کہ انسان اپنے گناہ کی پاداش میں یہاں آیا اور یہ دنیا اذیت ناک ہے جہاں وہ اپنے کیے کی بھگتے گا۔

اقبالؔ نے بعض مفکرین سے اتفاق کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ شجرِ ممنوعہ دراصل شجرِ علم تھا اور اس پھل کو کھانے سے روکنا دراصل آدم کو قبل از وقت "انانیت" سے ناواقف رکھنا تھا کیونکہ اس کے لئے ذہنی بالیدگی، علم و تبحّر، فرق و تمیز، محنت اور مشقّت شعور و آگاہی کا ہونا لازمی تھا اور جس کے لئے بتدریج مراحل سے گزرنا تھا۔ لیکن آدم اس تک ایک ہی جست میں پہنچنا چاہتا تھا اور پھر اس شجرِ ابدیت کا ثمرِ ممنوعہ کھانا زندگی کے اس اسرار کا پانا تھا جس کے باعث وہ موت پر فوقیت رکھتا ہے یعنی موت انسان کو ابدی نیند سے ہمکنار کرنا چاہتی ہے تو انسان افزائش کے ذریعہ نئی زندگی دینا چاہتا ہے اور جس کے جواز میں نئے آدم کا ظہور ہوتا ہے اور اس طرح آدم کے فنا و بقا کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

اقبالؔ نے جنّت سے آدم کے رخصت کا منظر پیش کرتے ہوئے اُن اوصاف کو بتلایا ہے جو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو آدم کو فرشتوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ فرشتے ششدر و حیران تھے کہ آدم کائنات میں کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ کہیں ہبوطِ آدم کسی انقلاب کا پیش خیمہ تو نہیں۔ چنانچہ فرشتے آدم سے کہتے ہیں ؎

سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوش تر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی

اقبال نے "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" کے عنوان کے تحت آدم کی افضلیت و برتری کو بتلایا ہے کہ وہ اپنے جوہر کو کام میں لاتے ہوئے دنیا کی تسخیر کر سکتا ہے اور دنیا کی ہر چیز اس کے تصرف میں آ سکتی ہے اور انسان کی رسائی آسمان تک ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ تعمیرِ خودی کی جانب راغب ہو اور کوشش و جستجو اور حرکت و عمل سے کارہائے گراں مایہ انجام دے۔

یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

فردوسِ گمشدہ کی یاد آدم کو تڑپاتی رہی۔ آدم سوچتا رہا کہ زوالِ آدم کس کا زیاں ہے۔ یزداں کا یا خود آدم کا۔ اقبال نے جنتِ یزداں

سے آدم کا رشتہ وہ تعلق برقرار رکھتے ہوئے اس خلا کو پُر کرنا چاہا جو خدا اور بندے کے درمیان حائل ہے ؎

تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دُور نہیں
وہ جلوہ گاہ تیرے خاک داں سے دُور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اُٹھا یہ مقام آسماں سے دُور نہیں

خیر کا جذبہ آدم کی سرشت میں ہوتا ہے لیکن یہ جذبہ فکر و عمل کے بغیر ظاہر نہیں ہوتا اور نہ ہی اس تک رسائی ممکن ہے۔ جو فکر صحت مند اور متوازن ہوتی ہے اور جو عمل صالح ہوتا ہے اور جو جستجو فلاح و بہبود کے پیشِ نظر ہوتی ہے اس کا انجام کار بھی بہتر ہوتا ہے۔ اس طرح جذبۂ شر بھی انسان میں چھپا رہتا ہے اور یہ اس وقت تک دبا رہتا ہے جب تک اس پر خیر حاوی رہتا ہے اور جب خیر کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے تو یہ جذبۂ شر سر اُٹھاتا ہے اور جس کے نتیجہ میں پراگندگی، انتشار، ناآسودگی، برہمی اور افراتفری پیدا ہوتی ہے۔ نفسِ انسانی کو سارے جذبات و کیفیات پر دسترس حاصل ہے۔ اس کی مثال ایک ہادی اور ناظم قوت کی سی ہے جو جذبات کو قابو میں رکھتی ہے۔

اقبال نے نفسِ انسانی کی حقیقت کو بتلاتے ہوئے لکھا ہے:

"دراصل وہ کوئی شئی نہیں ہے بلکہ حقیقتِ فاعلہ ہے۔ انسان کی تمام شعوری زندگی کی کثرت ایک وحدت میں منسلک ہے جو ہدایت اور مقصد کوشی کرتی ہے۔ اسی وجہ سے نفس نہ سلسلۂ زماں کے اندر ہے اور نہ مکاں کے اندر

وہ زمان و مکاں سے ماوراء اور حقیقتِ مادیہ اور مقصد کوشی کا نام ہے۔ نفس فہم و عمل کے اغراض کے لئے فطرت میں علت و معلول کی کڑیاں بنا لیتا ہے جن کا حقیقتِ مطلقہ میں کوئی وجود نہیں۔"

اقبال کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نفس کا تصور ان کے یہاں حرکی اور فعلی ہے اور وہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے اور نفس ادراک و عمل کے درمیان واسطہ بنے ہوئے ہے اور توجیہات بھی دریافت کرنے لگتا ہے۔

پیکرِ خاکی میں عرفانی اور روحانی ایسی قوتیں مضمر ہیں جن کو بروئے کار لاکر خارج کو تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ عرفانِ نفس میں خاک کو اکسیر بنانے کا گُر ہوتا ہے اور روحانی قوت کے بغیر قوتِ ارادی کی تشکیل نہیں ہوتی۔ روحانی قوت جہاں انسان کو تقویٰ اور پرہیزگاری سکھاتی ہے وہیں اس کے حوصلے اور عزائم کو بڑھاتی ہے تاکہ فطرتِ انسانی خارج پر غالب آسکے۔

ضبطِ نفس سے نفسانی حرص و ہوس کا سدِ باب ہو سکتا ہے، اور ضبطِ نفس سے بے راہ روی اور ذہنی پراگندگی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر صالح عمل کے لئے سمت اور راہ مل سکتی ہے اور اس ضبطِ نفس سے کوتاہ اندیشی اور عجلت پسندی کو روکا جا سکتا ہے تاکہ دور اندیشی اور بُردباری کے لئے میدان ہموار ہو سکے اور نفس صحت مند اور صالح خطوط پر کاربند ہوتے ہوئے منزل کی تلاش کر سکے۔

اقبال نفسِ انسانی کی بقا کے قائل ہیں۔ انھیں تصوّف کے

مسئلہ فنا سے اختلاف ہے کہ اس طرح نفسِ انسانی اَنا اور خودی کی پرورش
و پر داخت نہیں کر پاتا ہے ۔ وہ تو پہچانِ نفس کو بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں
پاتا بلکہ نفسِ انسانی کو کم مایہ اور حقیر گردانتا ہے ۔ اور اس معاملہ میں
اغماض و اجتناب بھی روا رکھا جاتا ہے ۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر
تصوف کے اس مسلک سے اقبال کو اختلاف رہا ہے ۔ وہ نفس کی
پرورش و پر داخت اور بقا و تحفظ کے قائل ہیں ۔ اس لئے ہی اقبال
نے پہچانِ نفس اور عرفانِ نفس کی اصطلاحیں وضع کی ہیں تاکہ اس طرح
نفس کی اہمیت و افادیت ظاہر ہو اور احیائے نفس کے لئے آبیاری
کی جا سکے ۔

انسانی عظمت پہچانِ نفس اور عرفانِ نفس سے ہی حاصل ہوتی ہے ۔
اقبال نے پہچانِ نفس کی تلقین اس لئے کی ہے کہ ہم اپنی پنہاں صلاحیتوں
کو جانیں ، اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانیں اور پھر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار
لاتے ہوئے کوشش و جستجو اور حرکت و عمل سے کام لیں لیکن تہذیب
نفس کا خیال رکھتے ہوئے اخلاقی اقدار سے بے بہرہ نہ ہوں ۔ پہچانِ نفس
کی اسی کوشش سے انسانی سیرت کی تشکیل ہوتی ہے اور اسی عملِ
پیہم سے خودی کا راستہ روشن ہو جاتا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ خودی
اپنی تعمیر کرنے لگتی ہے ۔ پہچانِ نفس ، مقصد سے لگاؤ ، تعلق ، اُنس اور
عشق سے ہی عمل کے جذبات اُبھر آتے ہیں اور یہ جذبات محرک بن کر
انسان کو عمل کی جانب آمادہ کرتے ہیں ۔ پہچانِ نفس دوسرے معنوں
میں اَنا یا خودی ہے گویا جس انسان نے اپنے نفس کو پہچانا ، اس نے
اپنی خودی کو پہچانا اور اپنی عظمت کو مانا ہے ۔ یہیں سے عظمت و مقام

کی جانب مراجعت ہوتی ہے۔

نفسِ انسانی کا جب مقصد سے لگاؤ اور تعلق ہو جاتا ہے تو مقصد آفرینی کے لئے سبیل نکل آتی ہے۔ کبھی تو شعوری طور پر اور کبھی کوششِ پیہم کے ذریعہ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مقاصد کی اس لگن کو اقبال نے "عشق" کہا ہے۔ عشق کی اصطلاح خودی کو مستحکم کرنے کا ایک بڑا وسیلہ ہے۔ لگاؤ اور تعلق جب جذب وشوق کی حدوں تک پہنچ جاتا ہے اور اس جذب کی کیفیت میں نفسِ انسانی چبھن اور خلش کے ذریعہ مقصد کے اشہب کو تازیانہ لگاتی ہے تاکہ مقصد و منزل کی جانب پیش رفت ہو اور تیز گامی سے وہ جلد منزل سے ہمکنار ہو۔ اس وقت روحانی اور جسمانی، خارج اور داخل سارے عناصر کام میں لائے جاتے ہیں۔ وجدان وعمل کی وجہ سے ساری حقیقتیں مرتفع ہونے لگتی ہیں۔ اس شعور وآگاہی اور بصیرت سے ہی زندگی اور مقصدِ زندگی کو سمجھنے میں مدد بھی ملتی ہے۔

عرفانِ نفس دوسرے معنی میں انسان کی خودی کی چاہت ہے۔ جس کی "اسرارِ خودی" کے دیباچہ میں خلیفہ عبدالحکیم نے بڑی اچھی طرح صراحت کی ہے کہ:

"خودی کی ماہیت کو جاننا عرفانِ نفس بھی ہے اور عرفانِ رب بھی۔ اور اس عرفان میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زورِ خودی سے حیاتِ عالم وابستہ ہے اور ہر انفرادی نفس کی استواری اس کی زندگی کی ضامن ہے۔ جو قطرہ شبنم بنتا ہے وہ چند لمحوں میں نابود ہو جاتا ہے، جو قطرہ اشک

بنتا ہے وہ ٹپک کر نابید ہو جاتا ہے لیکن جو قطرہ صدف نشین ہو کر اپنی خودی کو مستحکم کر لیتا ہے وہ گوہر بن جاتا ہے جس کی موجِ نور تلاطمِ قلزم میں بھی منتشر نہیں ہوتی۔"

گویا عرفانِ نفس کے مدارج طے کر کے نفس اور خودی مستحکم ہو جاتی ہے اور اسے خطرہ و حذر نہیں رہتا۔ وہ بے خوف و خطر ہو جاتی ہے۔ عرفانِ نفس کے لئے ضبطِ نفس لازمی ہے جو قطرۂ اشک کو آنکھ سے ٹپکنے نہیں دیتا اور ٹھہرے ہوئے آنسو کو موتی بنا دیتا ہے کیونکہ بہنے کے بعد آنسو اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ہے۔ اقبال نے نفس کشی کے وہ معنی نہیں لئے ہیں جو رہبانی تصورات میں ملتے ہیں۔ اقبال کے یہاں نفس کشی آرزوں کا قلع قمع نہیں ہے۔

انسانی عظمت کے لئے خودی کا ارتقار ضروری ہے اور خودی کے ارتقار سے تسخیر کائنات ممکن ہے۔ انسان کے لئے تسخیر کائنات اپنی مکمل ارتقار کے بعد یقینی ہے۔ یہ ایک طویل سفر ہے اور اس کے لئے وقت چاہیئے۔ اسرارِ خودی میں اقبال نے خودی کی تربیت کی تین منزلیں قرار دی ہیں۔ پہلی منزل اطاعت ہے اور دوسری منزل ضبطِ نفس اور تیسری منزل نیابت الٰہی لازمی بات ہے کہ خودی ان تین منزلوں کے طے کرنے کے بعد تکمیل پا سکے گی۔

اطاعت کی اصطلاح اقبال نے ہرکس و ناکس کی پیروی و فرمانبرداری کے لئے استعمال نہیں کی ہے بلکہ اس لئے کی ہے کہ اپنے فرائض سے روگردانی نہ کی جائے۔ اپنے منصب کو پہچان کر فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جائے۔ یہ پابندی اور جبر بعد کو اختیار کی

صورت دھار لیتا ہے یعنی تکمیلِ خودی کے بعد وہ اختیاری عمل ہوجاتا ہے۔ ضبطِ نفس کی تلقین اقبال نے اس منشا و مقصد سے کی ہے کہ انسان اپنے نفس پر فرماں روائی رکھے تاکہ یہ نفس کسی دوسرے کے زیر نہ آسکے۔ اس سے انسان خود پرست بنتا ہے۔ خودی کی تیسری منزل نیابتِ الٰہی ہے یعنی انسانِ کامل کی منزل ہے جہاں انسان اپنے نفس پر حکمرانی کے بعد ساری کائنات پر حکومت کرنے لگتا ہے۔

★ نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

★ نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمید مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

★ ہے گرمی آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سُورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

★ خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سُراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ

★ عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

★ ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو، تابعِ ستارہ نہیں

★ اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی

✦ حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلّیات میں

✦ تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو ہی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

✦ حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
میری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

جب تک انسان اپنے نفس میں فطرت کی تمام قوتوں کو مرتکز نہ کرے تسخیر عناصر کی قوت بیدار نہیں ہو سکتی ۔ چونکہ انسان فطرت اور حیات کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اس لئے بھی اس کو مظہر حیات ہونا چاہیئے اور اپنی ارتقائی صلاحیت کو بروئے کار لانا چاہیئے ۔ اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے تسخیر کائنات کی ذمہ داری انسان کو سونپی گئی ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اپنے مسلک کو پہچانے اور فرائض سے عہدہ برآ ہو اور ذوق وشوق سے کام لے ۔

اقبال نے نیابتِ الٰہی کا جو تصوّر پیش کیا ہے وہ مردِ کامل کا تصوّر ہے ۔ ویسے مردِ مومن ، مردِ تمام ، قلندر اور خلیفۃ اللہ فی الارض ، کی اصطلاحیں اقبال کے یہاں کم وبیش ایک ہی معنی میں استعمال کی گئی ہیں اکثر اقبال کے تصوّرِ مردِ مومن کے بارے میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ یہ صرف مسلمانوں تک محدود ہے یا یہ صلاحیت مسلمانوں میں مل سکتی ہے یہ سراسر غلط بیانی ہے ۔ دراصل مردِ کامل کا بہتر نمونہ مردِ مومن پیش کر سکتا ہے کہ اس کی خودی کو لاالٰہ الاّاللہ سے تقویت ملتی ہے ۔ اس کلمہ سے خودی بے جان ہو جاتی ہے ۔ جب انسان کو معلوم ہو جائے کہ سوائے

خدا کے کوئی معبود قابلِ تعظیم نہیں ہے تو وہ کسی کی غلامی پسند نہیں کرے گا اور اس میں قلندرانہ شان اور فقیرانہ بے نیازی پیدا ہو جائے گی ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

فقر، قلندری، غیرت، خودداری، خیر، خودی، جلال و جمال سے انسانِ کامل کی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔

اقبال نے بتلایا ہے کہ فقر ایک ایمانی جذبہ ہے جس سے "یقین" پیدا ہوتا ہے اور اس یقین ہی سے حرکت و عمل کی قوت اور تسخیر کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔ فقر ایک ایسا عنصر ہے جو انسان کی خود آگاہی کو جلاتا ہے اور غیرت کو بیدار کرتا ہے۔ غیرت کا بیدار ہونا بھی انسانِ کامل کے لئے لازمی ہے کیونکہ اس سے خودی کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور انسان کسی قسم کا غیر اخلاقی سودا نہیں کرتا جو اس کے مقام اور مرتبہ کو کم کر دے۔ فقر کے لئے گدائی موت کا پیغام ہوتی ہے جو انسانِ کامل کو سخت کوشی، جد و جہد اور خواہش خطرات سے روکتی ہے ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے دست و بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

✤

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے انسانِ کامل کی ایک بڑی خصوصیت کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے :

" وہ اپنے اعجازِ عمل سے تجدیدِ حیات کرتا ہے ۔ اس کی فکر زندگی کے خوابِ پریشاں کی نئی تعبیر پیش کرتی ہے۔ وہ پُرانی اصطلاحوں کو نئے معنی پہناتا ہے اور حقائق کی نئی توجیہہ پیش کرتا ہے ۔"

وہ تاریخ کی تخلیقی رَو کو اپنے حسبِ منشاء جدھر چاہتا ہے موڑ دیتا ہے اس کے ذریعہ انسانی صفاتِ عالیہ کا اظہار تاریخ میں اعلیٰ سیرت کی شکل میں ہوتا ہے لیکن اس کی جدوجہد اس سے ہم آہنگ ہوتی ہے، وہ جانِ عالَم اور جمیع موجودات کا خلاصہ ہے ۔ اقبال نے اس کی ذات کو " سوارِ اشہبِ رواں " اور " فروغِ دیدۂ امکاں " سے تشبیہ دی ہے اور اس کی ذات سے ایجاد و تسخیر کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں ۔ اس طرح کی تخلیقی صلاحیتیں جب پیدا ہو جاتی ہیں تو انسانِ کامل اپنے معاشرے کو ان اوصاف سے واقف کراتا ہوا ان کی کایا پلٹ دے گا اور ایک نئے معاشرے کو وجود میں لائے گا جو انسانی عظمت کا مظہر ہوگا ۔ ان تخلیقی صلاحیتوں اور جذب و عمل کی قوت سے ہی انسانِ کامل میں مقناطیسی کشش پیدا ہوتی ہے جو سب کو اپنی جانب راغب کرتی ہے ۔ گویا انسانِ کامل جانِ عالَم اور جمیع موجودات کا خلاصہ ہے ۔ ایجاد و تسخیر کی صلاحیتیں ہی اُسے ممتاز بناتی ہیں ۔

انسان کی فضیلت اس کی تخلیقی صلاحیت میں ہے ۔ یہی تخلیقی صلاحیت اس کو خدا سے قریب کر دیتی ہے کیونکہ "تخلیق" خالق کائنات کی صفت ہے ۔ یوں بھی خدا نے آدم کو کائنات میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے اور آدم کی فطرت کو فطرتِ الٰہی کے مطابق ٹھہرایا ہے ۔ تب ہی تو سارا جہاں اس ٹوٹے ہوئے تارے کو ماہِ کامل بنتا دیکھنا چاہتا ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

اقبال اور جوہر شناسی

اقبال بڑے جوہر شناس تھے۔ انھوں نے جوہر شناسی سے کبھی اغماض نہیں کیا۔ جن ممتاز ہستیوں نے اپنے جوہر اور صلاحیتوں سے اقبال کو متاثر کیا ہے یا جن کے جوہر عظمتِ آدم اور عروجِ آدم کے محرک بنے ہیں اقبال نے انھیں سراہا ہے۔ اقبال اجتماعی اور عالمگیر مقاصد کو عزیز رکھتے تھے اور انفرادی زندگی پر اجتماعی زندگی کو فوقیت دیتے تھے۔ وہ ایثار و قربانی جیسی اخلاقی قدروں کی آبیاری کو قومی مفاد کے لئے ضروری جانتے تھے۔ جن سے زندگی میں توازن اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے ورنہ فرد اور سماج کے درمیان خلا پیدا ہو جاتا ہے اور انسان اپنے فرائضِ انسانی کو بھول بیٹھتا ہے۔

قوم میں اجتماعی شعور، انفرادی شعور سے ہی پیدا ہوتا ہے، اور یہ

اجتماعی شعور کسی مبلغ عظمتِ آدم کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ جو اپنے شعور و آگاہی سے معاشرے اور قوم کو متاثر کرتا اور راہ دکھاتا ہے اور جس پر بعد کو سب چل پڑتے ہیں۔ اس طرح باشعور اور باعمل فرد سے استفادہ اور تقلید سے ہی کام بنتا اور کاروان جادہ پیما ہوتا ہے۔ گویا فردِ واحد کی انفرادی سعی وجہد، شعور و وجدان سے بنی نوع آدم کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ فرد کی جماعتی اور قومی کوششیں ہی جماعت اور قوم میں تاریخی شعور اور قومی وقار کو اُبھارتی ہیں۔ "کلیاتِ اقبالؒ" ایسے عظیم اور ممتاز ہستیوں کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔ اقبال نے ان عظیم ہستیوں کے وجدان اور عمل کو سامنے رکھتے ہوئے اُن کے کارناموں کو پیش کیا ہے جو عروج آدم کا باعث بنے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت صدیقؓ، حضرت بلالؓ، حضرت طارقؒ، مولانا رومؒ، ٹیپو سلطان، نادر شاہ، خاقانی، شکسپیر، حکیم نطشے، کارل مارکس، نپولین، مسولینی، اور لینن کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

نپولین (۱۷۶۹ء - ۱۸۲۱ء) پر قلم اُٹھاتے ہوئے اس کے جوشِ عمل اور سعیِ پیہم کو اقبال نے سراہا ہے۔ اقبال کی نظم "نپولین کی مزار پر" جہاں جوشِ عمل اور سعیِ پیہم کی دعوت دیتی ہے وہیں زندگی کی نعمتوں سے استفادہ کرنے کی تلقین بھی کرتی ہے۔ نپولین کی کارکردگی سے اقبال نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب انسان اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جان لیتا ہے اور اس طرح پہچانِ نفس سے وہ آدم کی بازیافت کرلیتا ہے تو اس تگ و تاز سے اس کے عزم و حوصلے بلند ہوتے ہیں اور مردہ و خفتہ صلاحیتیں جِلا پاتی ہیں۔ جوشِ عمل سے ہی تقدیر کے راز فاش ہوتے ہیں۔ نپولین کی زندگی ان ہی انقلابات

اور ہنگاموں سے دوچار ہوئی اور اس کے دل نے عمل وجذبہ کے اُٹھتے ہوئے تلاطم کو ساحل سے ہمکنار کیا اور ان موجوں نے ساحل کی سوغات کی صورت میں فرانس کی شہنشاہیت پائی۔

جوشِ عمل میں جب تلوار کی سفاکی پیدا ہو جائے تو وہ ایران کے کوہِ الوند کو بھی پگھلا سکتا ہے جیسا کہ سکندر کے جوشِ عمل نے ایرانیوں کو مفتوح بنا دیا تھا۔ یہ جوشِ عمل کبھی سیل کی صورت میں بہنے لگتا ہے تو تیموری جلال بن جاتا ہے اور نشیب و فراز کو تیزی سے عبور کر جاتا ہے نظم کے آخر میں حافظ کے اس شعر سے نپولین کے پیغام کی خوب ترجمانی ہوتی ہے کہ زندگی کا بھرپور فائدہ اُٹھایا جائے، اپنی آواز پیدا کی جائے اور اثر کو بڑھایا جائے۔ یہ سب زندگی ہی میں ممکن ہے ورنہ عاقبت ایک ایسی وادی ہے جس پر خاموشی اور سکوت طاری ہے۔

کارل مارکس (۱۸۱۸ - ۸۳ء) : اقبال کی دُور رس نگاہ نے کارل مارکس کے نظریۂ اشتراکیت میں بعض ایسے عناصر پائے تھے جو کارگر اور سُود مند تھے۔ اور جو اسلامی اصولوں سے مشابہت و مماثلت رکھتے تھے اشتراکی نظام معیشت کے ان اصولوں کی ہم آہنگی کو دیکھتے ہوئے اقبال کی دلچسپی بڑھ گئی۔ کارل مارکس نے جن اصولوں کو مدوّن کرنا چاہا تھا اسلام عہدِ قدیم سے ان کی ترغیب دیتا آیا ہے۔ مثلاً طبقاتی کشمکش سے نجات، محنت کش اور نچلے طبقے کی شدھار، ترقی اور فلاح و بہبود کے کام، برادرانہ سلوک، سرمایہ دارانہ نظام کی بے اعتدالیوں کی روک تھام، دولت کی مساویانہ تقسیم، ملوکیت اور اجارہ داری کا خاتمہ وغیرہ۔

اقبال کو کارل مارکس کی اس بات سے اتفاق تھا کہ مزدور کو سرمایہ

پر فوقیت ہے کیونکہ دولت، مزدور اور محنت کے ذریعہ ہی کمائی جاتی ہے جبکہ سرمایہ داروں کے یہاں مزدور پر سرمایہ کو ترجیح حاصل ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سرمایہ کے عوض سب کچھ خریدا جاسکتا ہے اور در اصل سرمایہ ہی محنت اور پیداوار ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے فرسودہ اور انسان سوز رویئے سے زمانہ تنگ و عاجز آچکا تھا۔ اس بات کی بڑی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ نئے اصولِ معاشرت تشکیل پاجائیں جس میں سب ہی کو سہولتیں اور مراعات حاصل ہوں۔ یہ دیرینہ خواہش اشتراکی نظامِ معیشت کی صورت میں پوری ہوئی۔ اشتراکی نظام نے جہاں غریبوں کو روٹی اور روزی دی وہیں ان سے روحانی آسودگی چھین لی۔ کیونکہ اشتراکی نظریہ کی بنیاد جدلیاتی مادیت پر قائم ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کارل مارکس کی نظر میں ملعون نظام ہے کیونکہ مزدور اور محنت کش کی بدولت سرمایہ داروں کو آسائش وسہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور سرمایہ داروں کی بدولت مفلسی وغربت ان کے حصے میں آتی ہے۔ بھلا دنیا اسے کب تک گوارہ کرسکتی تھی۔ پرانے افکار کی تجدید کے بجائے نئے افکار وخیالات کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشی نظام کی نئی صورت گری کی جائے۔ چنانچہ اس کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ جب محنت کش اور مزدور بیدار ہوئے تو وہ علم وحکمت کی چالبازیوں اور سرمایہ داروں کی شاطرانہ چالوں سے خبردار ہوگئے اور انھوں نے پرانے نظریات واصولوں کو خیرباد کہا اور سرمایہ دارانہ نظام کے اصولِ معاشرت سے بغاوت کی تاکہ وہ سماج میں اپنے مقام کو بلند کرسکیں۔ اور اپنی عظمت کو منوا سکیں۔ روس کا بورژوائی طبقہ ہی نہیں بلکہ دُنیا کا

محنت کش طبقہ بھی کارل مارکس کا رہینِ منت ہے کہ اس نے مزدوروں میں نئی بیداری پیدا کی۔ ان کے مقام و مرتبہ کو بلند کیا اور اس طرح صحیح معنی میں آدم کو عظمت سے روشناس کیا۔

لینن (۱۸۷۰-۱۹۲۴ء) :- اقبال مشرق و مغرب کے فرسودہ اصول اور ملعون نظامِ معاشرت سے نالاں تھے۔ وہ اس بات کے آرزومند رہے کہ کوئی مجاہد ایسا اُٹھے جو ظلم و استبداد، اور سرمایہ دارانہ نظام کی بے اعتدالیوں کی روک تھام کرے۔ اقبال یہ کام ارتقائے انسانی کے لئے لازمی سمجھتے تھے تاکہ انسان طبقاتی گروہ بندیوں سے اونچا اُٹھ سکے۔ اقبال کی اس خواہش و آرزو کی تکمیل لینن نے کردی۔ لینن اشتراکیت کا بہت بڑا داعی تھا اور وہ انقلاب، تغیر و تبدیلی پر ایقان رکھتا تھا۔ اس کا مزاج طبعاً انقلابی واقع ہوا تھا۔ اس نے اپنے اثر سے جماعت بنائی تاکہ زارِ روس کا اقتدار چھن جائے۔

اقبال کی نظم "لینن خدا کے حضور میں" جہاں اس کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتی ہے وہیں مقامِ آدم اور عظمتِ آدم کا تعین کراتے ہوئے آدم کو ان آلودگیوں سے نکلنے کی تلقین کرتی ہے جس کے لئے لینن کوشاں رہا۔ خاص کر اہلِ یورپ کی پیدا کردہ بیکاری، عریانی، میخواری اور افلاس جو اس نے مفتوح کو سوغات کی صورت میں دی تھی۔ قیصریت کی دھاندلی سرمایہ دارانہ نظام کی بے اعتدالیاں، محنت کشوں کی حق تلفیوں کا سدباب ہو۔ مادی ترقی نے قلب و رُوح کے احساسات پر ضرب کاری لگائی ہے اور جذبات جس طرح مجروح ہوگئے ہیں اس لعنت سے معاشرہ کو اس سے

بچایا جائے تاکہ بنی آدم کو آدم کی قدر وقیمت کا اندازہ ہو اور غریبوں کا اس طرح استحصال نہ ہو اور محنت کشوں کی محنت سے پیدا شدہ ناکردہ کار امیری کا خاتمہ ہو۔

لینن کی یہ خواہش رہی ہے کہ دنیا سے سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے۔ دولت اور سرمایہ کی مساویانہ تقسیم ہو۔ لینن کی عقل پرستی نے اس کو ملحد بنا دیا تھا۔ ویسے اس کی تعلیمات انسانی عظمت کی ضامن ہیں۔

مسولینی (۱۸۸۳ - ۱۹۴۹ء) کی عظمت اور فاشزم کی مقبولیت کو اقبال نے اپنے دورۂ اٹلی کے دوران میں دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ اس تحریک نے ساری قوم اور خصوصاً نوجوانوں میں جو حرکت وگرمی پیدا کردی تھی اور جس طرح قومی جذبات کو ابھارا تھا یہ اسی کا خلاصہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دینے لگے تھے اور ایک قومی دھارے میں مل بہنے کو ضروری سمجھنے لگے تھے۔ گویا سوچ وفکر کے دھارے بدل گئے تھے۔ نئے خطوط پر ملک اور معاشرہ کی تشکیل ہونے لگی تھی۔

مسولینی کے زاویۂ فکر اور جدتِ عمل نے ساری دنیا کو متاثر کر دیا تھا اور اقبال بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کے قلب و دماغ پر جو اثرات مرتب ہوئے انھوں نے اس کو نظم کر دیا۔ ندرتِ فکر اور جدتِ عمل کی کیا اہمیت اور افادیت ہے اس کو واضح کرتے ہوئے مسولینی نے یہ ثابت کر دکھایا کہ قومی مفاد اور مقاصد کے لئے ان عناصر سے کیا کیا فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں۔

قوم کی کایا پلٹنے اور اس میں تغیر و تبدیلی لانے کے لئے ندرتِ فکر و عمل کی ازحد ضرورت ہوتی ہے۔ اس ندرتِ فکر و عمل سے ذوقِ انقلاب جنم لیتا اور فروغ پاتا ہے۔ اسی جدتِ فکر و عمل سے قوم میں جوانی کی تازگی، تیزی اور حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اور قومی جوش امڈ آتا ہے۔ اسی ندرتِ فکر و عمل سے ایسے معجزات صادر ہوتے ہیں کہ عقلِ انسانی محوِ حیرت ہو جاتی ہے۔ ذرّہ کو آفتاب، پتھر کو لعل بنانے کا گُر اسے خوب آتا تھا۔ یہ مسولینی کی ندرتِ فکر و عمل کا نتیجہ تھا کہ قوم نے ترقی کی اور ملک مشہور و مقبول ہونے لگا۔ اس کے شہروں کو دیکھ کر پہچاننا مشکل ہو گیا تھا کہ آیا یہ وہی شہر ہیں۔ خاص کر روم کی حالت ازحد حیرت انگیز تھی۔

اقبال کی یہ نظم مسولینی کے پیغامِ عظمت کی مظہر ہے۔ مسولینی کی وجہ سے فرسودہ خیالات، پامال نظریات، بندھی ٹکی پالیسی اور روایتی انداز کی جگہ نئے خیالات، افکارِ نو اور ندرتِ عمل جگہ پا سکے تاکہ اس طرح کمی کی تلافی ہو سکے اور انسان لکیر کا فقیر بن کر نہ رہے۔

نادر شاہ افغان:- اقبال نے نادر شاہ افغان پر قلم اٹھاتے ہوئے بڑے اچھوتے انداز سے اس کی شخصیت اور عظمت پر طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کو افغان کے لئے ابرِ رحمت مانا ہے۔ جس طرح ابرِ رحمت سے گل و برگ حیات پاتے ہیں اور پھر سے تر و تازہ ہو جاتے ہیں، یہ ابر افغانیوں کی زندگی کے لئے سود مند اور کارگر ہوا۔ نادر شاہ کو اپنی قوم کا جو درد تھا اور زندگی کی جو گرمی اور حرارت اس میں تھی، اس جوہر کو اقبال نے محسوس کیا تھا جو قوموں کی کایا پلٹ سکتا ہے۔

طارق: غازی کی عظمت، اس کے جہاد اور شہادت میں پنہاں ہوتی ہے۔ طارق اندلس کے میدانِ جنگ میں جن عزائم اور حوصلوں کے ساتھ گیا تھا۔ اور اپنی جس حرارتِ ایمانی کا ثبوت دیا تھا اور جس چیز نے اسے بے خوف و نڈر بنایا تھا وہ موت کا تصور تھا کہ موت تو برحق ہے۔ اگر موت آنی ہے تو وہ جنگ میں بھی آ سکتی ہے۔ چنانچہ خدا کے نام کی خاطر بے خوف و خطر وہ جنگ میں شامل ہو گیا نہ اس کو مالِ غنیمت سے کچھ تعلق تھا اور نہ کشور کشائی سے۔ اس کی نگاہ میں تلوار کی سفا کی تھی اور وہ طوفان کی طرح دشمن کی سمت بڑھتا جا رہا تھا۔ اس جذبۂ ایمانی اور یقینِ محکم نے اسے ہزاروں پر فتح یاب کیا۔ گویا جذبۂ ایمانی اور یقینِ محکم جیسے عناصر نے اس کو عظمت بخشی۔

ٹیپو سلطان:۔ اقبال نے اپنی نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" میں ٹیپو کے پیغام عظمتِ آدم کو واضح کیا ہے۔ سلطان ٹیپو نے آدم کی عظمت کے لئے حق پرستی، آزادی، قوتِ ارادی، کوشش و جستجو، عملِ پیہم اور جذبۂ دل کو ضروری جانا ہے جس سے آدم تزکیہ نفس اور عرفانِ نفس کے مقامات سے واقف ہوتا ہے اور وہ حصولِ مقصد یا مقصد آفرینی کے لئے آرام و آسائش کو تج دیتا ہے۔ ٹیپو نے اس آرام و آسائش کو تجنے کے لئے کہا ہے جو آدم کو کاہل اور نکما بنا دیتے ہیں۔ اس لئے کہ اس آرام و آسائش میں گرفتار ہونے کے بعد آدم کی ساری تخلیقی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں کیونکہ ترقی و عرفان کی راہ میں آرام ہمیشہ مانع رہا ہے۔ آرام عمل کی گرمی اور حرارت کو مسدود کر دیتا ہے۔ یہ انسان کے جذبۂ عمل کو سرد کر کے اس کو منزل سے ہٹاتا اور

بھٹکاتا ہے اور اسی آرام و آسائش کی وجہ سے انسان تعیش پسند بن جاتا ہے اور اس میں تساہل، کاہلی اور غفلت شعاری کے مضر جراثیم سرایت کر جاتے ہیں۔

سلطان ٹیپو نے نمود و نمائش سے بچنے کی بھی تلقین کی ہے جو انسان کو حق اور حق پرستی سے پرے لے جاتے ہیں۔ انسان کو جان لینا چاہیئے کہ دنیا کی ساری آسائش کی چیزیں فانی ہیں اور ان کو ثبات نہیں اس لئے اس کے پیچھے دیوانہ وار طواف نہ کرے۔ محفل گداز کو دیکھتے انسان بے خود و بے ہوش ہو جاتا ہے اور کچھ دیر کے لئے دنیا اور مافیہا سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایسی محفل میں شریک نہ ہو، اجتناب و گریز کرے۔

حصولِ مقصد کے لئے دل سے کام لیں، عقل کا غلام نہ بنیں کیونکہ عقل جہاں انسان کو راہیں بتلاتی ہے وہیں بھٹکاتی اور وسوسوں میں ڈالتی بھی ہے چنانچہ دل کو عقل کی غلامی سے بچایا جائے۔ انسان کا طرزِ عمل اور طریقۂ عمل آلودگیوں سے پاک ہونا چاہیئے۔ حق و باطل کو ایک ساتھ نتھی نہ کیا جائے کیونکہ باطل کی دوئی پسندی سے حق پرستی پر حرف آتا ہے۔

حکیم نطشے : اقبال ذہنی اعتبار سے نطشے سے قریب تھے۔ خاص کر ان کا فلسفۂ خودی نطشے کے فلسفہ سے قریب تر ہے۔ اپنے مقصد سے لگن، جستجو اور عشق اور اس کو پانے کے لئے جد و جہد اور حرکت و عمل کو اقبال بھی نطشے کی طرح ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ ان ہی مدارج سے گزرنے کے بعد خودی کی تشکیل ہوتی ہے اور انسان کی پنہاں صلاحیتیں اس پر آشکار ہوتی ہیں اور وہ اپنے نفس کو پہچان لیتا ہے۔

اقبال اور نطشے کے فلسفے میں بڑی حد تک مماثلت ہونے کے باوجود ایک سب سے بڑا اختلاف بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اقبال خدا کے معترف ہیں اور اور نطشے منکر۔ لیکن نطشے کے اخلاقی تصوّرات قرآنی تعلیمات سے قریب ہیں۔ نطشے فرد کو فوق البشر کے معیار پر لانا چاہتا ہے جب کہ اقبال کا انسانِ کامل یا مردِ مومن اس سے قدرے مختلف ہے۔ اقبال انسانِ کامل میں ملکوتی صفات بھی لانا چاہتے ہیں، پھر فقر، غیرت، حمیت، خودی اور خودداری کو انسانِ کامل کے لئے ضروری جانتے ہیں۔ تصورِ فوق البشر اور انسانِ کامل میں ایک بنیادی مقصد ضرور ملتا ہے کہ دونوں انسان کی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔ اگرچہ نطشے کا فلسفہ ملحدانہ ہے لیکن کہیں کہیں اس میں اسلامی رنگ جھلکتا ہے۔

اقبال نے بالِ جبریل، پیامِ مشرق اور ضربِ کلیم میں اظہارِ خیال کیا ہے کہ اگر نطشے کو کسی مرشدِ کامل کی صحبت نصیب ہوتی تو جو کمی اس کے فکر و نگاہ میں رہ گئی ہے وہ جاتی رہتی۔ اقبال نے ایک جگہ حاشیہ میں لکھا ہے کہ:

"وہ اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ اس لئے اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستہ پر ڈال دیا۔"

نطشے نے فلسفۂ خودی اور تصورِ فوق البشر کے ذریعہ انسان کو جس عظمت و مرتبہ پر پہنچانا چاہا ہے اس کے پیچھے آدم زاد سے وابستہ ساری ہمدردیاں موجود ہیں۔ وہ انسان کی رسائی اور پہنچ کو بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی رفعتِ تخیل اور فکر کی اُڑان اونچی تھی لیکن توحید سے محرومی نے اس کے ضابطۂ اخلاق میں وہ پاکیزگی اور طہارت نہ آنے دی

جو نفسانی خواہشات اور گناہ کی آلودگی سے روک سکے۔

خاقانی : خاقانی کی شاعری فہم اور ادراک کے پہلو لئے ہوئے ہے۔ وہ بڑا زیرک واقع ہوا تھا۔ اسرارِ کائنات پر اس کی نظر تھی۔ اس نے اپنے ایک شعر کے ذریعہ بنی آدم کو اس کی غفلت شعاری سے خبردار کرتے ہوئے قانونِ مکافاتِ عمل کا ذکر کیا ہے جو دورِ حاضر میں رائج ہے اور اس قانون کا یہ اثر ہے کہ کوئی ابلیست کا گرویدہ ہے اور کوئی پرستار ہے آدم نے اپنے انبیاء کا اتباع چھوڑ دیا ہے۔ جس ابلیس نے آدم کو جنت سے نکالا تھا اس کی اطاعت اور محکومیت ہے۔ ابلیس کے اثرات اتنے غالب آچکے ہیں کہ آدم سے شرافت اور آدمیت ختم ہو چکی ہے۔ جب تک آدم ابلیس کے چنگل سے نہیں نکلے گا وہ اپنی عظمت و برتری کو نہ جان سکے گا۔

رومی : اقبال نے اپنی نظم " رومی " کے تحت مولانا روم کا پیغام منظوم کیا ہے۔ اقبال مولانا روم سے بے حد متاثر تھے۔ کیونکہ مولانا نے عقل و عشق کی گتھیوں کو بڑی خوبی سے سلجھایا تھا اور پہچانِ نفس کی تعلیم دی تھی تاکہ انسان خود کو پہچانے اور اسرارِ کائنات تک رسائی حاصل کرے آدم کو صرف نیاز، محکومی اور احتیاج سے ہی کام نہیں لینا چاہئے بلکہ اپنے اندر چھپی ہوئی اَنا، حاکمیت اور استغنا کو جاننا چاہئے۔ اور آدم کے کھوئے ہوئے مقام و مرتبہ کو پانا چاہئے۔ آدم نے اپنی خودی کو بھلا دیا ہے اس کی خودی کے تار ٹوٹے ہوئے ہیں۔ بھلا ایسے میں خودی کے نغمے کیسے نکلیں گے اگر آدم نے مولانا روم کی مثنوی پڑھی ہوتی تو وہ یوں خودی سے غافل نہ ہوتا اور اس کا عشق مستحکم ہوتا اور حضورِ اکرم سے اُنس و تعلق پیدا ہو جاتا اور وہ ان کے احکامات پر چلنے کی کوشش کرتا۔

شیکسپیر : شیکسپیر نے انسانی فطرت کی اپنے کلام میں بڑے حسن و خوبی سے عکاسی کی ہے اور انسانی منہج اور رسائی کا نمونہ پیش کیا ہے ۔ ان کی فکر اور ان کا تخیل اونچا تھا ۔ وہ دور کی کوڑی لاتے تھے ۔ آسمان تک ان کے فکر و تخیل کی رسائی تھی ۔ ایسا لگتا تھا جیسے شیکسپیر کی فطرت ہستی کا آخری مقصود ہو ۔ انھوں نے اسرارِ کائنات کی عقدہ کشائی کی اور خدا و فطرت کے راز داں بن گئے ۔ ان کی ہدایات اوروں کے لئے مشعلِ راہ ہیں اور بنی نوع انسان کو عروج و ترقی کا پیغام دیتی ہیں ۔ شیکسپیر کے مشاہدۂ فطرت نے یہ بات عیاں کر دی کہ دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا ذہن ہو تو انسان بات کی تہہ تک پہنچتا ہے اور تسخیرِ عالم کے مراحل آسان ہو جاتے ہیں ۔ شیکسپیر نے انسان کی خود اعتمادی کو بڑھایا اور بھڑ کایا ہے ۔ شیکسپیر پر لکھی ہوئی اقبال کی اس نظم میں ان خیالات کا اعادہ ہے ۔

رام چندر جی : اقبال رام چندر جی کے کردار کی خوبیوں اور ان کی تعلیمات سے متاثر تھے ۔ رام چندر جی نے اپنے جذبۂ ایثار، خلوص و محبت اور شجاعت و بہادری سے عظمت کی بلندیوں کو چھو لیا تھا، اور انھوں نے ایک عظیم انسان کی طرح مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے بھی حوصلوں کو نہیں کھویا ۔ انھوں نے اپنے فکر و تعلیم سے ہندوستان کا نام بلند کیا تھا اور ہندوستانیوں کو متاثر کیا تھا ۔ اس لئے اقبال انھیں امامِ ہند کہتے ہیں ۔

حضرت صدیق رض : حضرت صدیق رض کے جذبۂ ایثار و قربانی نے اقبال کو بے حد متاثر کیا تھا ۔ کیونکہ قومیں ایثار و قربانی کے جذبے سے

ترقی کرتی ہیں اور بامِ عروج پر پہنچتی ہیں ۔ حضرت صدیقؓ بڑے حساس واقع ہوئے تھے ۔ وہ دوسروں کے درد و تکلیف کو سمجھتے تھے ۔ وہ مساوات کے علمبردار تھے اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے ۔ جب ایک بار حضورِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ صاحب استطاعت راہِ حق میں مال و اسباب پیش کریں تاکہ جہاد کے لئے تیاریاں کی جاسکیں عشقِ محمدی سے سرشار اور جذبۂ ایثار کی آخری حدوں کو چھونے والے حضرتِ صدیقؓ نے اپنا سارا اثاثہ حضور کی خدمت میں پیش کیا کہ اس طرح ضرورت مندوں کی مدد ہو جائے ۔ حضور اکرمؐ آپ کے جذبۂ ایثار سے بے حد متاثر ہوئے اور انھیں عزیز رکھنے لگے ۔ اقبال بھی حضرت صدیقؓ کے جذبۂ ایثار سے بے حد متاثر ہوئے کیونکہ اس سے قوموں کی کایا پلٹ جاتی ہے اور قومیں عظمت و وقار حاصل کرتی ہیں ۔

حضرت بلال : اقبال نے حضرتِ بلال کے عشق و صدق کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ عشق و صدق سے آواز میں کشش اور دل پذیری پیدا ہوتی ہے اور پیغام میں گیرائی آتی ہے ۔ حضرت بلال کی اذان میں دل کو موہ لینے والی کشش تھی جسے سُن کر لوگ کشاں کشاں چلے آتے تھے اور فرق و امتیاز جاتا رہتا تھا ۔ انسان کو عظمت صرف اعلیٰ النسل سے تعلق پر حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے اوصاف حمیدہ اور خصائلِ پسندیدہ کی وجہ سے قابلِ تعظیم ہوتا ہے ۔ کہنے کو حضرتِ بلال حبشی النسل تھے اور حبش سے تعلق رکھتے تھے لیکن عشقِ محمدی نے انھی خوبیوں سے مالا مال کردیا تھا اور ان کا رتبہ غلام سے بلند کردیا تھا ۔

سوامی رام تیرتھ : سوامی رام تیرتھ نے دنیا کی حقیقت کو

جانا تھا کہ یہ تو فانی ہے۔ ہر وہ خوب صورت شئے جو باعثِ کشش ہے اسے دوام نہیں۔ خود انسان کا جسم فانی ہے البتہ روح اپنے ماخذ سے جا ملتی ہے اس کو ثبات ہے۔ روحانی آسودگی انسان کی ترقی اور عرفانِ نفس کے لئے ضروری ہے۔

گوتم بدھ: گوتم بدھ نے اہلِ ہند کو یہ پیغام دیا تھا کہ انسان خاندان اور ذات کی بنا پر بڑا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے اوصاف اس کو بڑا بناتے ہیں عملِ صالح، پاکیزگی اور خدمتِ خلق کا جذبہ اس کو بلند اور برتر کرتا ہے۔ انسان سے ذات پات کی بُنیاد پر نفرت وحقارت کا جذبہ غیر اخلاقی ہے انسان ہونے کے ناطے ایک کو دوسرے سے انسانی ہمدردی ہونی چاہیئے۔ شودر اور برہمن ایک ہی آدم کی اولاد ہیں۔ پھر یہ بھید بھاؤ انھیں زیب نہیں دیتا۔ ان میں بھائی چارگی اور مساوات ہونی چاہیئے۔

نانک: گوتم بُدھ کے بعد نانک نے بنی آدم کو مساوات، بھائی چارگی کا پیغام دیتے ہوئے بتلایا کہ سب انسان آپس میں برابر ہیں۔ کوئی بڑا یا چھوٹا نہیں ہے۔ نانک نے بنی نوعِ انسان کو توحید کی دولت سے مالامال کیا تاکہ اس کی خودی نہ بھٹکے اور یہ بے خوف وخطر ہو جائے اور اپنی تسخیر کے لئے آگے بڑھتی رہے۔ وہ خدا کی اطاعت کرکے دوسروں کو زیر کرے اور اس طرح اپنی عظمت کا لوہا منوائے۔

انسانیت کی عظمت اور اقبال

اقبال کے یہاں انسانیت کا تصور وسیع اور بلیغ ہے ۔ اس تصور میں انسانی احترام، انسان دوستی، انسانی ہمدردی، انسانی آزادی اور بنی انسان سے انس ہی نہیں بلکہ انسان کی شخصیت کی تعمیر اور اس کی عظمت کا پہلو بھی آجاتا ہے ۔ اقبال کے فلسفۂ خیر و شر، فلسفہ حرکت و عمل اور مسئلہ جبر و اختیار کا منشا ہی انسانی عظمت کا استحکام اور انسانیت کی بقا ہے ۔

اقبال مبلغِ انسانیت ہیں، انھیں انسانیت کی عظمت کا پورا احساس ہے، وہ انسانیت سوزی، تنگ نظری، ریاکاری، نفاق، غلامی، جبر و استبداد کے خلاف برسرِ پیکار رہے ہیں ۔ اقبال اخلاقی اور روحانی اقدار کو عزیز رکھتے تھے اور انھوں نے ان اقدار کی بقا کے لئے جہد و سعی بھی کی ہے اقبال کا تصورِ انسانیت حقوق و مساوات، عدل و انصاف، اتحاد و یکجہتی انسان دوستی، انسان آزادی اور انسانی ہمدردی کو پیش کرتا ہے اور پر وقار زندگی گزارنے کا گر سکھاتا ہے ۔

اقبال نے "تصویرِ درد" میں اخوت اور محبت کا درس دیتے ہوئے

اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ محبت کے بغیر نہ تو بیمار قومیں شفا پا سکتی ہیں اور نہ ہی قوم کے افراد ایک دوسرے سے قریب ہو کر قوم کا مقدر بدل سکتے ہیں۔ اس کے لئے انسان کو اپنوں سے قریب ہونا پڑتا ہے۔ بے اعتنائی اور اجتناب دلوں کو قریب کرنے کی بجائے دلوں کو دُور کر دیتا ہے۔

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خُو رہنا
شرابِ رُوح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام وسبو رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

اقبال نے غلامی کی انسانیت دشمن ذہنیت کے خلاف اپنی کئی نظموں میں آواز اُٹھائی ہے، اور انسان کو بیدار کیا ہے۔ اس سلسلے کی نظموں میں نفسیاتِ غلامی، غلاموں کے لئے گلہ اور ابہام اور آزادی قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال نے محکوم کی حالت کو بتلاتے ہوئے غلامی سے پیدا شدہ افسردگی نومیدی، مردہ دلی اور زبوں حالی کی نشاندہی کی ہے۔ جو محکوم کو حاکم سے سوغات کی صورت میں ملتی ہے۔

آزادی سے بلبل میں بھی شاہین کی صفات پیدا ہوتی ہیں اور فقر دل میں شاہی جلال پیدا ہوتا ہے۔ آزادی کی گرمی سے زندگی سرگرم عمل ہو جاتی ہے اور غلامی کے جمود و سکوت کا خاتمہ ہوتا ہے

آزادی کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

(ہندی مکتب)

آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
(آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ)

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا
وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانہ کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

(غلامی کیا ہے؟)

اقبال تنگ نظری کے سخت مخالف تھے کیونکہ جہاں تنگ نظری ہو وہاں انسانیت اور انسان دوستی کا گزر نا ممکن ہے۔ تنگ نظری و مذہبی منافرت کے پس منظر میں انھوں نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں خاص طور پر "نیا شوالہ" قابلِ ذکر ہے۔ اقبال کی نظم نیا شوالہ کا پس منظر ہی مذہبی منافرت اور تنگ نظری کے خلاف آواز اٹھانا ہے۔ ذاتی مفاد کے لئے مذہبی پیشواؤں نے مذہب کو جس طرح بگاڑا ہے اور جس طرح لوگوں کے جذبات مشتعل کئے ہیں اس کے پیچھے ان کی خود غرضی چھپی ہوئی ہے۔ مذہبی پیشواؤں نے مذہب کو پر پیچ اس لئے بنایا ہے کہ ان کی ضرورت محسوس کی جائے اور ان کی

دوکان چلتی ہے۔ اسی ذاتی مفاد، تنگ نظری، اور مذہبی منافرت کا ردِ عمل اقبال نے "نیا شوالہ" میں بتلایا ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

اقبال نے جبر و استبداد کے خلاف آواز اُٹھائی ہے اور یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ بُزدل ہی ظلم و ستم سہتے ہیں۔ جس طرح ظلم کرنا انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہے اسی طرح ظلم سہنا بھی انسانیت سے کچھ کم گری ہوئی حرکت نہیں ہے۔ اقبال روس کے انقلاب سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے جاگیر دارانہ اور شاہی نظام کی زیادتیوں کے خلاف بھرپور آواز اُٹھائی ہے۔ اقبال مستحق کو اس کا حق دلانا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی ساری ہمدردیاں مظلوم کے ساتھ تھیں۔ انھوں نے اپنی

نظموں سے مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کا لہو گرمایا ہے اور ان میں اخلاقی جرأت پیدا کی ہے، خاص کر "فرمانِ خدا" (فرشتوں سے) میں یہ پیغام بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
اسیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

حق را بسجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

جوشؔ اور عظمتِ آدم

اقبالؔ کی طرح جوشؔ کے یہاں عظمتِ آدم کا ٹھوس اور واضح تصوّر نہیں ملتا۔ البتہ وہ انسانی فضیلت کا احساس رکھتے ہیں۔ ان کی بعض نظمیں عظمتِ آدم کی تشہیر بھی کرتی ہیں، البتہ عظمت کس طرح حاصل ہوسکتی ہے، ماسوا، کی تسخیر کس طرح ممکن ہے، پہچانِ نفس اور خودی کی بلندی کس، طرح اور کن حالات میں ممکن ہے، جوشؔ کی شاعری اس تعلق سے کچھ نہیں بتلاسکتی۔ جبکہ اقبالؔ کے یہاں اس کا طریقۂ کار ملتا ہے۔ چونکہ جوشؔ فطرتاً جمال دوست ہیں اس لئے دوسرے امور پر ان کی نظر کم ہی جاتی ہے جوش کا لہجہ اقبال سے قریب ہے لیکن تصورِ عظمتِ آدم کے معاملہ میں وہ اقبال کے قریب نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی جمال دوستی مانع رہی ہے۔

جوشؔ آدم کی نیابت کو تو مانتے ہیں لیکن آدم نیابتِ الٰہی کا حقدار کس طرح ہو سکتا ہے اور کس طرح وہ کائنات پر اپنی حکومت قائم کر سکتا ہے، اس تعلق سے بھی جوشؔ تہی دامن ہیں۔

جوشؔ کے یہاں عظمت کے لئے مقصد سے لگاؤ ملتا ہے۔ انھوں نے عشق اور لگن کو بھی مقصد آفرینی کے لئے ضروری جانا ہے۔ نظم "سوزِ ناتمام" میں جوشؔ نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ جب تک انسان میں کسی چیز کو پانے کی تڑپ رہتی ہے تب تک اس کی خواہشات اس کو عمل پر اکساتی ہیں، جہد وسعی کی دعوت دیتی ہیں۔ جب یہ تڑپ سرد پڑ جاتی ہے تو تڑپ کی وجہ سے زندگی کی جو حرارت ہوتی تھی وہ مفقود ہو جاتی ہے۔ انسان کو ناتمام خواہشات حرکت و عمل پر آمادہ بھی کرتی ہیں اور راہِ عمل پر گامزن رکھتی بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

یاں ایک بھی عمل نہیں بے ربط و سلسلہ
جو چیز ہے وہ اپنی جگہ لاجواب ہے
بے گانۂ حقیقتِ انفاس ہوشیار
ہر سانس ایک عالمِ صد انقلاب ہے
ہر جنبشِ نگاہ ہے اک انقطاع فصل
ہر لمحہ ایک منزلِ روزِ حساب ہے
صد گرمیٔ حیات ہے اک سوزِ ناتمام
جب شمع جل بجھی نہ تپش ہے نہ تاب ہے

نظم "ہمت کی ہوئی نیکی" میں بھی جوشؔ نے یہ بتلانے کی کوشش

کی ہے ۔ حرکت اور عمل خواہشات کی تکمیل کے لئے جاری و ساری رہتے ہیں ۔ انسان آرام و آسائش کو تج کر سعی و کاوش میں سرگرداں ہے گو اس جہد و عمل میں سکون محال ہے لیکن مقصد آفرینی اور عظمت کی خواہش اس کو سعی و جہد پر اکساتے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مقصود کو پا سکے ۔

ہر شئے کو مسلسل جنبش ہے راحت کا جہاں میں نام نہیں،
اس عالمِ سعی و کاوش میں انساں کے لئے آرام نہیں
چھائی ہے فضا پر تشنہ لبی، مفقود یہاں سیرابی ہے
ہر جسم میں اک بے چینی ہے ہر رُوح میں اک بے تابی ہے
ہر دل میں غرض اک کاہش ہے اُمید کا ساغر بھرنے کی
ہر شئے کی تڑپتی فطرت میں خواہش ہے ترقی کرنے کی
ہر لمحہ یہ خواہش روحانی جذبوں کو اُبھارا کرتی ہے
میداں کے تپتے ذرّوں کو سُورج سے پکارا کرتی ہے

انسان کی دلچسپیوں اور اس کے جذبۂ تجسّس کا جوش نے نظم "دوری" میں بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے اور اس میں انسان کی فطرت کو بتلانے کی کوشش کی ہے کہ جو چیز انسان سے ڈھکی چھپی یا دُور رہتی ہے وہ اس کی جستجو میں لگا رہتا ہے ۔ جیسا کہ آسمان تک پہنچنے کی جستجو اور اسرارِ افلاک کو جاننے کی تمنّا انسان کرتا رہا ہے ۔ ستاروں سے آگے کی تمنّا اس کو بے تاب کرتی رہی ہے ۔ اس طرح دور کی چیزیں اس کو متاثر کرتی رہیں ۔ نظم "دوری" ان ہی احساسات پر مبنی ہے ۔

دنیا کی ہر وہ صورت دل کو لبھا رہی ہے
جو دُور سے تجلّی اپنی دکھا رہی ہے
ہر چند کچھ نہیں ہے اُفتادگی کی ہستی
جب دُور ہو زمیں سے دل کھینچتا ہے پستی
پردے میں اس کشش کے اک پاک آرزو ہے
انساں میں یہ خدا کی پوشیدہ جستجو ہے

جوؔش انسان کے مقام سے خوب واقف ہیں ۔ وہ اس بات سے بھی واقف ہیں کہ وہ کن حیثیتوں سے افضل و برتر ہے ۔ انسان کے اشرف و افضل ہونے کا اعتراف انھوں نے اپنی نظم "حیوان" میں اس طرح کیا ہے ۔

میں نے یہ مانا کہ انساں میں ہے وہ روحِ عظیم
جس کے آئینے میں ہر تصویرِ یعقوب و کلیم
ہاں یہ سچ ہے کہ آدمی ہے وہ وجودِ سرفراز
خود دلِ صناعِ جن و انس کو ہے جس پر ناز
یاد رکھ لیکن یہ نکتہ بھی اگر انسان ہے
کچھ ہو انساں ایک ترقی یافتہ حیوان ہے

غرض جوش نے انسانی عظمت کو تسلیم تو کیا ہے لیکن انسانی عظمت کس طرح پیدا ہوتی ہے اور انسان کو اپنی عظمت منوانے اور مقام بنانے کے لئے کیا کرنا چاہیے ان گوشوں کی طرف جوش نے کم توجہ دی ہے ۔ جوش نے انسانی عظمت کے اعتراف میں اپنی کئی نظمیں لکھی ہیں لیکن ان نظموں میں نہ تو عظمت کا فلسفہ ہے اور نہ ہی کوئی واضح نکتہ نظر ملتا ہے ۔ ان کی نظمیں راہ کا تعین بھی نہیں کرتیں بلکہ بکھرے ہوئے خیالات کو پیش کرتی ہیں ۔

احمد ندیم قاسمی اور عظمتِ آدم

احمد ندیم قاسمی کا تصورِ عظمتِ آدم بڑی حد تک انسانیت پر محیط ہے ویسے اقبال کی طرح انھوں نے بھی بنی نوع آدم کو حرکت و عمل اور تسخیر و جہد کے لئے آمادہ کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی جب حرکت و عمل کی بات کرتے ہیں تو ان کے سامنے ایک انقلاب ہوتا ہے جو ظلم و استبداد، حقارت و نفرت، تنگ نظری اور تعصب کا قلع قمع کرنا چاہتا ہے۔ انھیں اقبال کی طرح انسانی صلاحیتوں کا احساس ہے۔ اور اس بات کا بھی علم ہے کہ انسان عمل و انقلاب سے صحت مند معاشرہ ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ اسرارِ کائنات اور ممکناتِ حیات کو وجود میں لاسکتا ہے۔ چونکہ ندیم فطری طور پر شاعر ہیں اس لئے اقبال کی طرح ان کے پاس خودی کے ارتقار کا تصور اور ٹھوس فلسفہ نہیں ملتا۔ لیکن احساسِ نفس کی چنگاریاں ان کے پاس ملتی ہیں جو حالات کے جھونکوں سے سلگ اٹھتی ہیں۔

جیسا کہ ابھی میں نے کہا ہے کہ ان کی شاعری انسانیت پر مبنی ہے ۔ وہ ان انسانی اقدار کا بھی احساس دلاتے ہیں جو انسان کو اشرف بناتی ہیں اور اس کو عظمت سے روشناس کراتی ہیں ۔

ندیم انسان کی رسائی سے مایوس نہیں ہیں ۔ خلاؤں پر کمند ڈالتا ہوا انسان چاند تک رسائی حاصل کرنے والا انسان اور ستاروں سے آگے بھی جہاں کا متلاشی انسان انھیں متاثر کرتا ہے اور ان کی شاعری کو گرماتا اور حوصلہ دیتا رہا ہے ۔ ندیم جب انسان کی بات کرتے ہیں تو وہ زمین کی حد بندیوں سے آزاد ہو کر عالم کی بات کرتے ہیں ۔ وہ انسان کو مذہب، ذات پات، قوموں اور نسلوں میں نہیں بانٹتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح انسان کی عظمت کو دھکا پہنچتا ہے اور آفاقی عظمت متاثر ہوتی ہے ۔ جب بھی ندیم انسان کی بات کرتے ہیں تو ان کے مخاطب سارے انسان ہوتے ہیں ۔ وہ مذہبی رشتہ سے کہیں زیادہ انسانی رشتہ کو استوار اور پائیدار کرنا چاہتے ہیں کیونکہ انھیں ڈر ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کے ہاتھوں ایک انسان دوسرے انسان کا خون نہ کر بیٹھے اور سارے انسانوں کو شرمندگی نہ اٹھانا پڑے ۔ انسان کا نقصان ندیم کے لئے بنی نوع آدم کا نقصان اور انسان کا فائدہ نوعِ انسان کا فائدہ ہے ۔ لازمی بات ہے کہ وہ انسانی عظمت کو قوموں اور نسلوں سے ابھار کر عالمی اور آفاقی سطح پر لانا چاہتے ہیں ۔ ندیم کے اس پیغام میں بڑی آفاقیت ہے بڑی وسعتِ نظری ہے ۔ ندیم کا یہ تصور نظریاتی نوعیت کا ہے ۔ اس میں اقبال کے تصور کی طرح نہ گرمی ہے اور نہ یہ تصوّر عملی ہے ۔ تصور عملی سے یہاں میری مراد وہ شعوری اور حرکی کوشش ہے جس سے انسان جادہ پیما ہوتا ہے اور منزل کو

جا لیتا ہے ۔ اقبال کی نظر اگر ندیم میں پیدا ہو جاتی تو ان کا پیغام جذباتی کے ساتھ ساتھ عمل بھی ہو جاتا ۔ انھوں نے اگر اقبال کی طرح عظمت کی عملی صورت گری کی کوششیں کی ہوتی تو بات اور پُر سوز ہو جاتی تھی اور رنگ چوکھا آجاتا تھا ۔

ندیم کو یہ احساس ہے کہ انسان فرشتوں سے برتر ہے اور صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات ہے ۔ کوئی چیز اس کو مسخر نہیں کر سکتی بلکہ وہ تمام چیزوں کو مسخر کر سکتا ہے ۔ جذبۂ تسخیر کی خواہش ندیم کے پیغام کو منور کرتی ہے ۔ ندیم نے انسان کو اقبال کی طرح بے خوف و خطر ہونے کی ترغیب دی ہے ۔ انسان کو دلاسا دے کر اس کو حوصلہ دلایا ہے کہ وہ ہمت نہ ہارے ۔ جیے اور کوشش کرے ۔ انسان کی گری ہوئی حرکتیں ندیم کے لئے تکلیف کا باعث ہوتی ہیں ۔ ان اخلاقی اور کرداری خوبیوں کو کھونے سے انسان کے پاس کچھ نہیں رہ جاتا ۔ جو وہ دعویٰ کرے کہ وہ انسان ہے ۔

ندیم نے اپنی شاعری میں مساوات، بھائی چارگی، اخوت، انسان دوستی کا پیغام دیا ہے ۔ ان کی شاعری کے محور انسان دوست انسانیت اور عظمتِ آدم ہے ۔

بقول غلام رسول مہر :

" کوئی شخص انسانوں سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ وہ بلند عہدوں پر فائز ہیں اور ان سے مادی فائدہ پہنچے گا ۔ کوئی دولت کا پجاری ہے اور دولت مندوں سے رشتۂ الفت جوڑتا ہے ۔ کسی نے ہم مشربوں کی حد بندی کر لی ہے اور اپنا پیار انہی تک محدود رکھتا ہے ۔ اس حد سے باہر ہر گروہ سے بے زار یا کم از کم

بے تعلق رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی حجت رُوئے زمین پر امن و اطمینان کی وہ بہشت پیدا نہیں کر سکتی جو انسانوں کے قلب و رُوح کے لئے قدوسی آسودگی پیدا کر سکے۔ صرف آدمیت کے تقاضوں کی پابندی ہی ایک مثالی نظام بروئے کار لا سکتی ہے جس میں تمام انسان ایک جدِّ امجد کی اولاد، ایک بزرگ کی نسل اور ایک بڑے گھرانے کی شکل میں زندگی بسر کریں۔ ندیم کا نصب العین بھی آدمیت ہے۔ اس نے شعر کی شکل میں جو کچھ کہا ہے مقصد و نصب العین اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ البتہ کہیں وہ اس کے لئے براہِ راست دعوت دیتا ہے، کہیں انسانیت کے کسی حد درجہ مظلوم طبقے کے لئے درد بھرے نوحے لکھتا ہے۔ کہیں جوشِ عمل کی صدا لگاتا ہے۔ کہیں کہتا ہے کہ رات اندھیری ہے تو ہو، منزلِ مقصود دُور ہے تو مضائقہ نہیں، صبحِ امید ضرور طلوع ہوگی۔"

احمد ندیم قاسمی انسان کو اس کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ اس کو عمل کی جانب راغب کرتے ہیں۔ وہ انسانی ورثے سے بخوبی واقف ہیں۔ ندیم کی یہ نظم انسان کی اہمیت کو بخوبی بتلاتی ہے ؎

ہم نہ ہوں تو اس اُجڑے خدائی کا سہاگ
جس طرح خرمن میں بجلی جسطرح جنگل میں آگ

ہم نے دھرتی کے کلیجے میں نمو پیدا کیا
ہم نے مٹی کے مرکب سے سبو پیدا کیا
خوشۂ انگور سے ہم نے لہو پیدا کیا
ہم نے یہ ہنگامہ زار رنگ و بو پیدا کیا

گو عناصر چیختے، چلّاتے، غرّاتے رہے
ہم ضمیرِ زندگی میں جذب ہوجاتے رہے
ہم نے دھوئی چہرۂ آفاق سے گردِ ملال
پربتوں پر ہم نے ڈالے گھومتی راہوں کے جال
ہم نے صحراؤں کو بخشا سبزہ زاروں کا جمال
ہم نہ ہوتے تو کسے تھی بحر گردی کی مجال
ہم نے ناپیداکرانی کے کنارے پا لیے
خاک میں ذرّوں کو یوں چھانا ستارے پا لیے

ندیم نے خلا میں پہلے انسان کو پرواز کرتے ہوئے دیکھ کر انسانی عظمت کا ذکر بڑے دل نشیں انداز میں کیا ہے ؎

کیوں لرزنے لگے ہو ستارو
یہ تو پرواز کی ابتدا ہے
آسماں میری منزل نہیں ہے
آسماں تو خلا ہی خلا ہے
اپنی گم گشتہ جنّت کو پا لوں
صرف اتنا مرا مدّعا ہے
ہوشیار اے فرشتو کہ پھر سے
ایک سجدے کا وقت آ رہا ہے

ندیم کو فردوسِ گم شدہ کا افسوس نہیں ہے۔ ان کو تو اس بات کا احساس ہے کہ جنّت سے نکلنے سے انسان کو نقصان نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی عظمت اور مقام

میں اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کو نیابتِ الٰہی ملی ہے ؎

ممکن ہے فضاؤں سے خلاؤں کے جہاں تک
جو کچھ بھی ہے آدم کا نشانِ کفِ پا ہو
ممکن ہے کہ جنت کی بلندی سے اتر کر
انسان کی عظمت میں اضافہ ہی ہوا ہے

انسان کی عظمت اور اس کی کرشمہ سازی کا احساس فرشتوں کو بھی نہ تھا۔ ندیمؔ نے فرشتوں کی حیرانی اور انسان کی رسائی کو بڑے دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے ؎

فرشتے چاند سے ہٹ کر ہیں اس خیال میں گم
کہاں سے چل کے یہ انساں کہاں تک آئے ہیں
ابھی تو خیر سے تسخیرِ عرش باقی ہے
ابھی تو اہلِ زمیں آسماں تک آئے ہیں

تقدیر پر انسان کی دسترس کو ندیمؔ نے یوں بیان کیا ہے ؎

میری قسمت کو نچائے گا ارادہ میرا
میرے پنجے میں سمٹ آئیں گی سب تقدیریں

نمونۂ کلام

قوتِ بازوئے انساں کے بغیر
خاک کا ڈھیر ہے عالم زر و سیم
اتنی عظمت کا تصور بھی محال
جتنی انسان کی محنت ہے عظیم

میری دنیا میں اگر ظلمت مسلّط ہے تو کیا
ابر میں لپٹی ہوئی شب کا مہِ کامل بھی ہوں
میں بظاہر اک بھنور ہوں چیخنے جذبات کا
لیکن اس بپھرے ہوئے طوفان کا ساحل بھی ہوں

دستِ تخلیق کی زنجیرِ طلائی کی قسم
ابھی انسان سے پوشیدہ ہے انساں کا جمال
ایک کہتا ہے غزل ایک بناتا ہے صنم
ایک کو دل بھی بہت ایک کو آفاق بھی کم

خدا شناس بھی اور خود شناس بھی ہوں
خدا سے دُور بھی ہوں اور خدا کے پاس بھی ہوں

یہاں زمیں پہ بھی تخلیق، کام ہے میرا
گو کبریائی سے منسوب نام ہے میرا
خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں
تمام دہر کا دُکھ سہنے والا ندیم ہوں میں

یہ فرش ہے عرش قدسیوں کا
اس وہم کو واقعہ بنا دو

اے جنّت گم شُدہ کے رازد
آدم اُبھرا ہے راستہ دو

ساری دنیا میرا کعبہ سب انساں میرے محبوب
دُشمن بھی دو ایک تھے لیکن دشمن بھی تو تھے انساں

اب اس سے بڑھ کے ہو کیا ربطِ کائنات وحیات
فضائیں گونجی ہیں انسان کی پکار کے ساتھ

بڑھا تو راہیں تراشیں، رُکا تو قصر بنائے
اُڑا تو گیت بکھیرے جُھکا تو پُھول کھلائے

سفینہ محوِ سفر ہو تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں تم سِدھارو بھی

پنڈت آنند نارائن مُلّا اور عظمتِ آدم

پنڈت آنند نارائن مُلّا مذہبی تفریق کو انسان کے لئے مضر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں مذہبی تفریق انسانوں کو قریب لانے کی بجائے دُور کرتی ہے۔ اور اس سے بنی نوع انسان کی سالمیت کو نقصان پہنچتا ہے اور عظمتِ آدم میں کھنڈت پڑتی ہے۔ وہ روحانی اور اخلاقی اقدار کو مادی اقدار پر فوقیت دیتے ہیں۔ کیونکہ مادی فتوحات انسان کو اس کے مسلک سے ہٹاتی ہیں۔ مُلّا نے اپنی شاعری میں انسانیت اور انسان دوستی کے جذبات کو اُبھارا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں انسان لاکھ ترقی کرے اور عظمت کی بلندیوں کو چھونے لگے اگر اس میں اخلاقی اور انسانی اقدار مفقود ہوں تو وہ اس عظمت کو نہیں ملتے جو اخلاقی گراوٹ کا سبب بنے جس میں انسانیت کی بجائے درندگی کے عناصر پائے جائیں۔ وہ اپنی نظم "اندھی لڑائی" میں کہتے ہیں ؎

کٹتے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں
یہ نادان انساں لڑے جا رہے ہیں
کوئی ان سے پوچھے لڑائی یہ کیوں
بشر کی بشر پر چڑھائی یہ کیوں
نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں
کسی طور رائج نہ یکسانیت ہو
نہ بیدار تقدیر انسانیت ہو
جو ہوتی ہو تجدید حیوانیت ہو
یہ اپنی سی لیکن کیے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں

آنند نارائن ملاّ نے اپنے نظریات کے تعلق سے ایک جگہ لکھا ہے:

"میں اس ذہن کو صالح قرار دیتا ہوں جو انسانیت کی ایک اکائی بن کر سوچتا ہے جو اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ انسانی فطرت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ تعلیم و تربیت سے نفسِ امّارہ پہ قابو پا سکتی ہے جو انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں اور جس کا مقصد ہے کہ اس کرۂ خاک پر ایک ایسا نظام رائج ہو جس میں انسان آزادی، شادمانی اور امن کے ساتھ اپنی پسند کی اجتماعی اور انفرادی زندگی بسر کر سکے اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو، اس وقت تک اس نظام کو لانے کے لئے اپنی بساط بھر کوشش

کرے ۔ بیمار ذہن وہ ہے جس کے سامنے کوئی انسانی مقصد نہیں۔ جو صرف اپنی ذات میں محصور ہے اور جو وقتی لذّت اور جنسی آسودگی کو زندگی کی سب سے اہم قدر سمجھتا ہے اور اسے یہی شکایت ہے کہ وہ جنسی آزادی سے اپنے لذّت طلب تقاضوں کو پورا کرنا چاہتا ہے دنیا اسے اتنی آزادی کیوں نہیں دیتی ۔ آسودگی تو دونوں قسم کے ذہن چاہتے ہیں اور غالباً اس پر بھی دونوں متفق ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی فنی تخلیق بغیر دل میں بغاوت کا جذبہ پیدا کئے وجود میں نہیں آتی لیکن ایک کی مراد آسودگی سے وہ معراجِ کیف ہے جو جذبات کو طہارت بخشتی ہے، شعور کو بیدار کرتی ہے اور روح میں ولولہ اور امنگ پیدا کرتی ہے اور دوسرے کے نزدیک اس قسم کی لذّتیت جو دل و دماغ کو آلودہ کرتی ہے اور جو وقتی تسکین (جس میں ایک تھکن بھی ہوتی ہے) دینے کے بعد ایک نیند طاری کر دیتی ہے ۔ میں اس شاعر یا ادیب کو جسے بدی پر نیکی کی آخری فتح میں یقین نہیں، چاہے وہ کتنا ہی بڑا فن کار کیوں نہ ہو وہ اُونچا مقام نہیں دے سکتا جو میں انسانی مستقبل میں یقین رکھنے والے بڑے فن کار کو دینے کو تیار ہوں ۔ جس حقیقت پر امیدوں کے خواب نہیں وہ انسان اور فن کار دونوں کی شکست ہے ۔"

مُلّا کے ان نظریات سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی عظمت کو انسانیت پرستی کی سمت لے جانا چاہتے ہیں ۔ وہ انسان کے چاند تک رسائی حاصل کرنے اور نئی نئی ایجادات کو وجود میں لانے اور اسرارِ کائنات

کو فاش کرنے ہی کو اس کی عظمت نہیں سمجھتے بلکہ وہ اس عملی صورت گری میں انسانیت کے تصور کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ تب ہی ان کے پاس عظمتِ آدم کا تصور اُبھرتا ہے جیسا کہ ملاؔ کے خیالات سے اس کا بھی اندازہ ہو چلا ہے کہ انسانی اور اخلاقی اقدار کی ان کے پاس کتنی وقعت اور اہمیت ہے اخلاقی اور انسانی اقدار کے بغیر تو انھیں انسان بونا اور پست دکھائی دیتا ہے۔ نظم "دو حقیقتیں" میں وہ کہتے ہیں ؎

الٰہی کس ارتقاء کے مرکز کی سمت تہذیب جا رہی ہے
کہ جیسے انسانیت سے اپنی بشر کو خود شرم آ رہی ہے
یہ عقل کی مادہ پرستی مزاجِ دُنیا بدل رہی ہے
یہ رُوحِ انساں کو رکھ کے اپنے قدم کے نیچے کچل رہی ہے
بڑے جو بنتے ہیں عقل والے انھیں بھی دل کا پیام دیدوں
سحر کے بے رُوح پیکروں کو حرارتِ خونِ شام دیدوں

ملاؔ کو انسان کے مقام کا احساس ہے۔ انھیں انسانی صلاحیتوں کا ادراک بھی ہے کہ انسان کی بدولت ہی دنیا میں رونق ہے۔ ان کا انسان حساس، خوددار، صاحبِ فقر اور غیرت مند ہے۔ وہ کسی کے آگے دستِ سوال نہیں پھیلاتا کیونکہ اس سے اس کے مرتبے پر آنچ آتی ہے اور اس کی عظمت متاثر ہوتی ہے۔ ان کا انسان آزادانہ زندگی گزارنے کا متلاشی ہے۔ وہ طفیلی بن کر زندگی گزارنا نہیں چاہتا ہے۔ اس میں زندگی گزارنے کا حوصلہ ہے۔

وہ نظم "انسان" میں کہتے ہیں ؎

کون ہے میرے سوا مالکِ افلاک و زمیں
نورِ فردا ہے نہاں جس میں وہ میری ہی جبیں
قصّہ دہر میں لیکن مجھے معلوم نہیں
اہرمن ہوں کہ سلیماں ہوں کہ خاتمِ کانگیں
طُور ہوں جذبۂ موسیٰ ہوں کہ فرعون ہوں میں
ربِ خاموش بتادے یہ مجھے کون ہوں میں

میں مدد غیر سے لوں یہ مرا دستور نہیں
مثلِ پروانے کے جینا مجھے منظور نہیں
گو شبِ تار ہے اور رہ میں کوئی نور نہیں
میں جو بھٹکا بھی تو جاؤں گا بہت دُور نہیں
میرے سینے میں ہے عصیاں کی تجلّی باقی
دلِ مضطر کو ہے اتنی تو تسلّی باقی

وارثِ دہر کہیں یہ دلِ شیدا تو نہیں
خضرِ ظلماتِ جہاں نورِ تمنّا تو نہیں
زندگی نام کہیں ذوقِ طلب کا تو نہیں
رازِ ہستی دلِ عاشق کا تقاضا تو نہیں
بحر کہتے ہیں جسے ہم، کہیں ساحل تو نہیں
راہ اب تک جسے سمجھے ہیں وہ منزل تو نہیں

ملا کے انسان کو ناموافق حالات کا احساس بڑی شدت سے ہے۔ ظلم بربریت، رنگ ونسل کا امتیاز اور ذات پات کی تفریق ان کے انسان کو کھائی جاتی ہے۔ وہ انسانی خون کو نوعِ انسان کا خون سمجھتے ہیں۔ انسان کے درمیان ہوتی ہوئی لڑائی کو انسان کا بڑا نقصان سمجھتے ہیں۔ ان کا انسان حیران ہے کہ انسانی راستے مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔ کبھی تو ان کے انسان کو اپنی شکست کا احساس ہوتا ہے کہ اس نے کچھ نہیں کیا لیکن ان کا انسان حوصلہ نہیں ہارتا۔ وہ ظلمات میں روشنی کے چراغ جلاتا آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے قدم رُک نہیں پاتے۔ اس کے حوصلے اس کو منزل کی جانب گامزن کرتے ہیں ؎

بشر ابھی اسیرِ دام دین ونسل و رنگ ہے
ابھی تو حل ہر اک نزاعِ زندگی کا جنگ ہے
قدِ حیات پر ابھی قبائے امن تنگ ہے
ابھی صدائے دوستی پہ ہر طرف سے سنگ ہے
ابھی خصوصیتیں دلوں میں ہیں جواں بڑھے چلو
علم کئے شہیدِ قوم کا نشاں بڑھے چلو

مفادِ عام پر ہر ایک گام تولتے ہوئے
شبِ حیات میں سحر کا رنگ گھولتے ہوئے
جہنموں پہ خُلد کے دریچے کھولتے ہوئے
بشر کے آنسوؤں کو برگِ گل سے رولتے ہوئے

مسرتوں سے پاٹتے غم جہاں بڑھے چلو
علم کئے شہید قوم کا نشاں بڑھے چلو

ملّا کا انسان روحانی، اخلاقی اور انسانی اقدار ہی کو بہت کچھ سمجھتا ہے جبکہ اقبال کا انسان ان کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتا ہے۔ اقبال کا انسان پہچانِ نفس پر زور دیتا ہے اور پھر اس پہچانِ نفس سے اس کے یہاں عشق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ حرکت وعمل پر آمادہ ہوتا ہے۔ مقصد آفرینی، مقام اور رتبہ کے لئے وہ کوشاں رہتا ہے۔ اقبال کے یہاں پہچانِ نفس دوسرے معنوں میں انسان کی خودی ہے اور اسی سے عظمتِ انسانی متّصف ہوتی ہے، اور حقیقت مرتفع ہونے لگتی ہے، اسرار فاش ہونے لگتے ہیں۔ اس کے لئے اقبال کا انسان شعور اور آگاہی سے کام لیتا ہے۔ جب اقبال کا انسان اپنے نفس میں فطرت کی تمام قوتوں کو مرتکز کر لیتا ہے تو اسے تسخیر کا جذبہ اُمڈ آتا ہے اور وہ نادیدہ جہانوں کی تسخیر میں کوشاں ہو جاتا ہے۔ ملّا کے یہاں عظمتِ آدم کے تصوّر میں باضابطہ کوئی ارتقائی اور عملی صورت نہیں ہے۔ ان کے خیالات پراگندہ ہیں۔ ان خیالات میں کوئی تسلسل اور شیرازہ بندی نہیں ملتی۔ اور نہ ہی کوئی واضح نقطۂ نظر عظمتِ آدم کا ملتا ہے۔ ملّا کے یہاں PROCESS کی بڑی شدت سے کمی محسوس ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے عظمتِ آدم کے تصوّر کو میکانکی نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ بس اخلاقی سدھار اور انسانیت پرستی ہی پر زور دیتے ہیں (اس کے یہ معنی نہیں کہ اخلاقی سدھار اور انسانیت پرستی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی ضرورت ہے اور بڑی سخت ضرورت ہے۔ اقبال نے

بھی اخلاقی اور انسانی اقدار کو انسانِ کامل میں یکجا کر دیا ہے۔ اس سے مفر کی کوئی صورت نہیں) لیکن تزکیۂ نفس کے ساتھ ساتھ نفس کا ارتقا بھی ضروری ہے۔ اس کی جانب ملّا کی نظر نہ جا سکی۔ کیوں نہیں جا سکی یہ وہی بہتر بتلا سکتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ترقی کرنا ہے تو ہمارے سامنے یہ ترقی کیونکر ہو سکتی ہے اور کس طرح ہم زینہ بہ زینہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اس کا تصوّر ہونا چاہیئے۔ ملّا کے یہاں تصوّرِ عظمتِ آدم کا بتدریج ارتقا نہیں ملتا لیکن جو بنیادی شرطیں مطلوب ہونی چاہئیں وہ یقیناً ان کے پاس ملتی ہیں۔ اس معاملہ میں ملّا کامیاب ہیں۔ اور ان کی سب سے بڑی کامیابی اس میں مضمر ہے کہ انھوں نے انسانوں کو خانوں میں نہیں بانٹا۔ وہ ہر ایک کے لئے ایک جیسا رویّہ اور ایک سا عمل اپنائے ہوئے ہیں۔

غرض اقبال سے ملّا تک پہنچتے پہنچتے تصورِ عظمتِ آدم کی مختلف شکلیں سامنے آتی ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ اقبال نے تصورِ عظمتِ آدم سے اُردو ادب کو کس درجہ مالا مال کیا ہے اور اقبال کا تصورِ عظمتِ آدم اور شعراء کی بہ نسبت کتنا جامع، مثبت اور ٹھوس ہے اور کوئی بھی شاعر اس معاملہ میں اقبال تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ اُردو شاعری کو اس معاملے میں اقبال سے آگے بڑھنا ہے۔

○

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بُت کدۂ صفات میں

حُور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیّلات میں
میری نگاہ میں خلل تیری تجلّیات میں

گرچہ ہے میری جستجو دَیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

گاہ میری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہّمات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں، حُسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بیکنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

○

اپنی جولان گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

کہہ گئیں رازِ محبّت پردہ داری ہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناں گوں

عجب مزا ہے مجھے لذّتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

○

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگِ گُل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سُورج کی کرن

حُسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

مَن کی دنیا؟ مَن کی دُنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دُنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

مَن کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

مَن کی دُنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
مَن کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جُھکا جب غیر کے آگے نہ مَن تیرا نہ تن

ہر چیز محوِ خود نمائی — ہر ذرہ شہیدِ کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی موت — تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی
تارے آوارہ و کم آمیز — تقدیرِ وجود ہے جُدائی

یہ پچھلے پہر کا زرد رُو چاند | بے رازو نیازِ آشنائی
تیری قندیل ہے ترا دل | تو آپ ہے اپنی روشنائی
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں | باقی ہے نمودِ سیمیائی

ہیں عقدہ کُشا یہ خارِ صحرا
کم کر گلۂ برہنہ پائی

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے!

مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں
یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے کہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری

مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

اس اندیشے سے ضبطِ آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مُغ زادے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زنّاری

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

طلسمِ گنبدِ گردوں کو توڑ سکتے ہیں
زجاج کی یہ عمارت ہے سنگِ خارہ نہیں

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیِ نظارہ نہیں

مرے جنوں نے زمانے کو خوب پہچانا
وہ پیرہن مجھے بخشا کہ پارہ پارہ نہیں

غضب ہے عینِ کرم میں بخیل ہے فطرت
کہ لعلِ ناب آتش تو ہے شرارہ نہیں

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقامِ پادشاہی

تری زندگی اسی سے ، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کجکلاہی

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لَا اِلٰہَ اِلَّا
لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

قلمی نام : قدیر امتیاز

اصل نام . محمد عبد القدیر

تعلیم : ایم ۔ اے (عثمانیہ)

ملازمت : ہمہ وقتی لکچرر سینٹ جوزف
کالج بنگلور
جز وقتی لکچرر ۔ پوسٹ گریجویٹ
اسٹڈیز شعبہ اردو بنگلور یونیورسٹی

تصانیف : رعنا (ناول) پتھر بولتے ہیں
(ناول) اور ایک تنقیدی
مضامین کا مجموعہ زیر ترتیب۔